ٹھنڈا گوشت



ٹھنڈا گوشت

ٹھنڈا گوشت

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعر و ادب لاہور
۷، ڈی بلاک سی سمن آباد،

ناشر .... نواز چودہری

مطبع .... معظم پریس لاہور

قیمت .... ۱۴/= روپے

ایشر سنگھ کے نام

جو حیوان بن کر بھی اِنسانیّت نہ کھو سکا

فہرست

	صفحہ
زحمتِ مہرِ درخشاں	۱۱
ٹھنڈا گوشت	۸۹
گولی	۱۰۰
رحمتِ خداوندی کے پھول	۱۱۳
ساڑھے تین آنے	۱۲۵
پیرن	۱۳۷
خورشٹ	۱۵۰
باسط	۱۶۳
شاردا	۱۷۴

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
مَیں ہوں وُہ قطرہ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

(غالب)

"زحمتِ مہرِ درخشاں"

بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا اخاب سات یا آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائد اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ آپس میں گڈمڈ — کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں۔ کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹریمیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران — سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں — سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔ آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ میں بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے کچھ دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا — اب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ میں لاہور میں ہوں۔ جہاں کبھی کبھی میں اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنال شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ وہ ان بورڈوں ہی تک محدود ہیں ـــــ بہت تشویش ہوئی ـــــ الاٹمنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دکانیں الاٹ کرا رہے تھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا۔ مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصّہ نہ لیا۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روزنامہ جدید خطوط پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے ملا۔ اخبار کا نام "امروز" تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی "ڈمی" تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو "امروز" کے غالباً چار پرچے نکل چکے تھے۔ اخبار کی گٹ اپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا۔ کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہو گا ـــ اگر ہو گا تو کیسے ہو گا۔

وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے ـــــ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا ـــــ کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں ـــــ کیا ادھر اردو بالکل نابید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی ـــــ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے ـــــ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہو گی ـــــ آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہدِ حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر بھی نظر ڈالتا تھا انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے۔ کیونکہ ان کے پاس ایک دم دولت آ گئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا۔ جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا ہو جانے والی ہے ـــــ اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لٹ پٹ کر آئے تھے ـــــ مہاجروں کے کیمپ دیکھے۔ یہاں خود انتشار کے رونگٹے کھڑے دیکھے۔ کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی حالت ویدنی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر یہ حالات کی بہتری ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہو گی ـــــ غرض کہ عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ ایک کا قہقہہ دوسرے کی آہ سے دست و گریباں تھا۔ ایک کی زندگی دوسرے کے عالمِ نزع سے مصروفِ پیکار تھی۔ دو دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک زندگی کا دھارا۔ ایک موت کا۔ ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرسنگی و تشنگی۔ شکم سیری و بلا نوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں ـــــ!

زحمتِ مہرِ درخشاں

فضا پر مردنی طاری تھی۔ جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اداس ہوتی ہیں اسی طرح "پاکستان زندہ باد" اور "قائدِ اعظم زندہ باد" کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا یک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں۔ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ فنِ دباغت کیا ہے۔ ریفیوجی کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے ـــــ سردیوں سے بچنے کے لئے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ ٹہنیاں کاٹ کر پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں۔ ان کے مکین بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے۔ کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے بھی ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو اتنا زبردست بھونچال آیا ہے۔ شاید اس کے کچھ جھٹکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے ہیں۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہو گی۔ پھر صحیح طور پر

معلوم ہو سکے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا۔ خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سنتا رہتا۔۔۔ بے ہنگم باتیں بے جوڑ دلیلیں۔ خام سیاسی مباحثے۔۔۔ اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا۔ کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اُڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہئیں، چنانچہ میں نے "ناک کی قسمیں"۔ "دیواروں پر لکھنا" جیسے فکاہیہ مضامین "امروز" کے لئے لکھے جو پسند کئے گئے۔۔۔ آہستہ آہستہ مزاح خود بخود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا۔ یہ تبدیلی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی۔ میں لکھتا گیا اور میرے قلم سے "سوال پیدا ہوتا ہے اور" سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" جیسے تیز و تند مضمون نکل گئے۔۔۔ جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میرے قلم نے گرد و پیش چھائی ہوئی دھند میں ٹٹول ٹٹول کر ایک راستہ تلاش کر لیا ہے تو۔ مجھے خوشی ہوئی۔ دماغ کا بوجھ بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ میں نے زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔۔۔ مضامین کا یہ مجموعہ بعد میں "تلخ ترش اور شیریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

طبیعت افسانے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ اس صنفِ ادب کو میں بہت سنگین سمجھتا ہوں۔ اس لئے افسانہ لکھنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن انہی دنوں میرے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی جو غالباً اوٹ پٹانگ چیزیں لکھ لکھ کر تنگ آ گئے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے آئے اور" ادارہ "فروغِ اردو" کے

اشتراک سے ایک ماہنامہ پرچہ "نقوش" جاری کیا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں "نقوش" کے پہلے چند پرچوں کے لئے کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔ جب وہ ناراض ہو گئے تو میں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا جو میرے اس مجموعے کا اب عنوان ہو گیا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہ افسانہ میرے سامنے پڑھا۔ وہ خاموش پڑھتے رہے۔ مگر مجھے اُن کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ "منٹو صاحب معاف کیجئے افسانہ بہت اچھا ہے لیکن "نقوش" کے لئے بہت گرم ہے۔"

قاسمی صاحب سے کبھی بحث نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے خاموشی سے افسانہ واپس لے لیا اور ان سے کہا۔ "بہت بہتر تو میں آپ کے لئے دوسرا افسانہ لکھ دوں گا آپ کل شام تشریف لے آئیے گا۔"

قاسمی صاحب جب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے "کھول دو" کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا۔ میں نے قاسمی صاحب سے کہا "ایک منٹ ـــــ آپ بیٹھیے میں افسانہ مکمل کر کے آپ کو دیتا ہوں"ـــــ اس افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں اس لئے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب افسانہ مکمل ہو گیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ "پڑھ لیجئے۔ خدا کرے آپ کو پسند آ جائے۔"

قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے

ٹ گیا جیسے کسی نے ان کو جھنجھوڑ دیا ہے ـــــ افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے میں نے ان سے پوچھا۔ "کیسا ہے؟"

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا۔ مختصراً کہا۔ "اچھا ہے۔ میں لئے جاتا ہوں" ـــــ اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

"کھول دو" قاسمی صاحب کے پرچے "نقوش" میں شائع ہوا۔ قارئین نے پسند کیا۔ ہر ایک کا ردِعمل یکساں تھا آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں۔ لیکن ایکا ایکی ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ حکومت کو یہ افسانہ امنِ عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ حکم ہوا "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے تک بند رہے ـــــ اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر امتناعی حکم اپنی جگہ پہ قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا۔ "اگر آپ "ٹھنڈا گوشت" شائع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی۔"

کافی دن گذرنے پر "ادبِ لطیف" کے نائب مدیر میرے پاس آئے۔ اور "ٹھنڈا گوشت" لے گئے ـــــ افسانے کی کتابت ہوگئی۔ کاپیاں جم گئیں۔ پروف نکل آئے۔ غلطیاں درست کر کے جب واپس پریس میں گئیں تو کسی کی نظر "ٹھنڈا گوشت" والی کاپی پر پڑی۔ اس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار کر دیا ـــــ قہرِ درویش برجانِ درویش اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شائع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کوئٹے میں تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے "ادبِ لطیف"

کے دوسرے شمارے میں "ٹھنڈا گوشت" چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ــــ افسانے کا مسودہ مجھے واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خط آ چکے تھے کہ میں ان کے "نیا دور" کے لئے کوئی افسانہ بھیجوں۔ میں نے اٹھا کر "ٹھنڈا گوشت" ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے اضتساب کے شکار نہ ہو جائیں ــــ "ٹھنڈا گوشت" یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس میرے پاس پہنچ گیا ــــ میں نے سوچا اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہیئے۔

چھ مہینے کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے "نقوش" پر سے "نہ چھاپو" والی قید ہٹادی۔ چنانچہ میں نے "نیا ادارہ" کے لئے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے "نمرود کی خدائی" رکھا۔ اس میں "کھول دو" کے ساتھ میں نے "ٹھنڈا گوشت" بھی شامل کر دیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین رسالہ "جاوید" کے اڈیٹر مقرر ہوئے تو آپ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ اشاعت کے لئے دوں۔ کافی دیر میں نے ٹال مٹول کی مگر آخر ان کے پیہم اصرار پر میں نے "نیا ادارہ" کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی کہ یہ "جاوید" والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں ــــ براہ کرم ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجئے۔ عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے

اور اسے "جاوید" کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکٹ میں آ گیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چودھری محمد حسین صاحب (اب مرحوم) کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انہوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پولس کی مشینری حرکت میں آ گئی۔

میں نے ایک روز اڑتی اڑتی سنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس "جاوید" کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کر لے گئی ہے۔ میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا۔ کسی نے اس خبر کی تصدیق کی۔ کسی نے کہا۔ "اجی ہٹایئے۔ یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے"۔ اس دوران میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب

ایک خبر سنئے ـــــ آج پولس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مارا۔ تلاشی لینے پر بچے کھچے چند پرچے اپنے قبضے میں لے لئے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈسپیچ رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچہ ہند و پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لئے گئے اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے

اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے ـــــ لیکن
ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع
اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے
خیر اس کی تصدیق خود بخود ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب
ذرا وہیں چلیئے۔ جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیئے گئے۔
میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہو گی۔"

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنوینر کرنل فیض احمد فیض اڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے۔ اس میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روئداد سنئے۔

"پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی
فیض احمد فیض کنوینر تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ)
مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت) وقار انبالوی (سفینہ)
اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے
"جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے
باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے۔ "غلامی سے آزادی
تک"۔ "رقصِ بسمل"۔ "سیلابِ چین"۔ یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں سے
"لورینگ سے فلیٹی تک"۔ "کھیڑا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے"

زیرِ بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے
دیگر اراکین نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام ٹل گیا۔ لیکن
نزلہ گرا "ٹھنڈا گوشت" پر۔ فیض نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا
اختر علی گرج اٹھے۔ "نہیں نہیں، اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا"
جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و
مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا۔ اور جب
ایف۔ ڈبلیو۔ بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں "ٹھنڈا گوشت"
سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ فرمانے لگے۔ "اس کہانی کی تھیم یہ
ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک
نہیں چھوڑی......" مجھے ہنسی تو آ گئی تھی۔ لیکن جب چودھری صاحب
غلط ترجمانی پر مُصر رہے تو مجھے افسوس ہوا — میں نے لاکھ سمجھایا۔
فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا۔ کہ
اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔"

چنانچہ چند دن بعد۔ میں، نصیر انور اور عارف حبیب المتین گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار
کرنے والے سب انسپکٹر چودھری خدا بخش تھے۔ بے حد شریف۔ کئی دن میرے مکان
کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ مجھ سے ملنے
میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا۔ "کل صبح کسی دوست

کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آیئے گا۔ تاکہ آپ کی ضمانت ہو جائے۔"

—— اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔

دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میرے دوست شیخ سلیم نے دستخط کئے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے۔ ان کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ عدالت سے خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہرحال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لئے یہ جگہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا —— نام تو ضلع کچہری ہے لیکن بے حد غلیظ جگہ ہے۔ مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑے —— ہتکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکاریں نہایت ہی دقیانوس ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ۔ تین ٹانگوں والی کرسیاں جن کی نشست کا بید ہی غائب ہے۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے۔ باغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کچیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے۔ برقع پوش عورتیں ننگے گرد سے اٹے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں۔ کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی بسور رہا ہے۔ اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات

میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں۔ پاس دوست یار بیٹھے ہیں
دورانِ سماعت میں ان سے بھی گفتگو جاری رہتی ہے۔

الفاظ ضلع کچہری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہاں کی فضا الگ۔ یہاں کا ماحول الگ۔ یہاں کی زبان الگ۔ یہاں کی اصطلاحات الگ ـــ عجیب و غریب جگہ ہے۔ خدا اس سے دور ہی رکھے۔

آپ کو نقل لینی ہو تو درخواست کے ساتھ "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کوئی مثل معائنے کے لئے نکلوانی ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کسی افسر سے ملنا ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ اگر کام فوری کرانا ہے تو پہیوں کی تعداد بڑھ جائیگی ـــ غور سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں تو آپ کو ضلع کچہری میں ہر عرضی پہیوں پہ چلتی نظر آئے گی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک چار پہیے۔ دوسرے دفتر سے تیسرے دفتر تک جانے کے لئے آٹھ پہیے و قس علیٰ ہذا ـــ اگر آپ عادی مجرم نہیں تو آپ کے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہو گی کہ کوئی آپ کے پہیے لگا دے اور دھکا دیدے تاکہ آپ ضلع کچہری سے باہر نکل جائیں۔

وکیل کا سوال درپیش تھا۔ عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جناب تصدق حسین خالد سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے کمال مہربانی سے خود ہی کہا کہ وہ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ چنانچہ ان کو ہی تکلیف دی گئی۔

خالد صاحب آئے۔ ہم ملزمین میاں اے ایم سعید پی۔ سی۔ ایس مجسٹریٹ درجہ اوّل

کی عدالت میں پیش ہوئے۔ میاں صاحب موصوف کسی زمانے میں کپتانی کے عہدے پر فائز تھے۔ مگر اب ان سے بندوق لے کر عدل و انصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی ـــــ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں۔ چھریرا بدن۔ رنگ سانولا ـــــ کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ ہم ملزمین سلام کر کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو اب ہماری طرف دیکھے بغیر میاں تصدق حسین خالد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بار پھر ضمانتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسری سماعت کی تاریخ مل گئی۔ ہم نے میاں سعید صاحب کو سلام کیا اور عدالت سے باہر نکل آئے ـــــ جون کا مہینہ تھا۔ سب کے حلق خشک تھے۔ مگر عارف عبدالمتین کا حلق تو بالکل لکڑی ہو رہا تھا ـــــ کاش وہاں کوئی پارٹی ممبر ہوتا۔

دو تین پیشیاں اس طرح بھگتے۔ موسم ظالمانہ حد تک گرم ہو چکا تھا۔ لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش "آواز پڑنے تک" عدالت کے باہر کھڑے رہتے۔ کیونکہ ڈر تھا۔ کہ اگر ہم اِدھر اُدھر ہو گئے تو مجسٹریٹ صاحب کا قہر نازل ہو جائے گا۔ شروع ہی سے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دل میں ہمارے خلاف فیصلہ مرتب کر چکے ہیں۔ میاں خالد نے مجھ سے کہا۔ "کیوں نہ ہم اس عدالت سے اپنا مقدمہ منتقل کرا لیں۔ مجسٹریٹ کا رویہ صاف مخاصمانہ ہے" ـــــ میں نے کہا "میاں صاحب چھوڑیئے۔ دوسری عدالت میں مقدمہ لے گئے تو کیا ہمیں وہاں لڈو پیڑے کھلائے جائیں گے۔ اپنے دیکھیے مقدمے کو نہیں۔"

میاں خالد مان گئے۔ چنانچہ دو تین پیشیاں بھگتے۔ استغاثے کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر، منیجر کپور آرٹ پریس لاہور۔ شیخ محمد طفیل حلیم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ سی آفس لاہور۔ سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ۔ اور چند اور حضرات رسمی طور پر پیش کیے گئے۔

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں "ٹھنڈا گوشت" تمام کا تمام فحش ہے۔ میاں خالد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے وہ نیک ہے۔ مگر اندازِ اظہار اور استعمالِ الفاظ غلط ہے۔ میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا۔ "کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں"۔۔۔ سید صاحب نے جواب دیا جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں"۔۔۔ آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے بُرے کردار تخلیق کرے۔

شہادتِ استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے حسب ضابطہ رسمی طور پر ہم سے چند سوال کیے جن کا مختصر جواب دے دیا گیا۔ یہ سلسلہ عدالتی زبان میں "استفسار ملزم بلا حلف" کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوال عدالت۔ آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون "ٹھنڈا گوشت" جو کہ رسالہ "جاوید" کے خاص نمبر میں بغرضِ اشاعت نصیر انور پرنٹر و پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمتین اور نصیر انور ایڈیٹر رسالہ مذکور کو جو کہ فحش تھا دیا۔ یہ

جرم زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کی تعریف میں آتا ہے۔ آپ وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب۔ (جو خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" "جاوید" میں بغرضِ اشاعت دیا۔ لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔

سوال عدالت۔ مقدمہ کیوں بنایا گیا؟

جواب۔ پولیس بہتر جانتی ہے۔ اس کا نقطۂ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے

سوال عدالت۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

جواب۔ اس موقعہ پر نہیں!

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ فہرست ہم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب تیئیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے۔ کہا "میں اتنا ہجوم نہیں بلا سکتا" — میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی — ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا "یہ ممتاز شانتی کون ہے" — عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے۔ ہم ہونٹ بھینچے خاموش رہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب درجہ اول چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے

چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیئے گئے۔ سمن جاری ہوئے۔ میں کسی گواہ سے نہ ملا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے۔ لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی۔ ہم اندر کٹہرے میں کھڑے رہتے تھے۔ اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انہیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی۔ سارا وقت جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی۔ چھوٹی بوتل میں وسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا ـــــ ادب سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ـــــ لیکن جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا "آخر فحاشی ہے کیا۔ منٹو کا افسانہ ٹھنڈا گوشت" میں نے پڑھا نہیں لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا۔ منٹو آرٹسٹ ہے۔"

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ میں نے رسالہ "جاوید" میں "ٹھنڈا گوشت" پڑھا ہے ـــــ یہ ایک ادب پارہ ہے ـــــ منٹو صاحب کی میں نے

تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے —— اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو نارواحرکت کی۔ اس کی سزا اسے فطرت کی طرف سے نفسیاتی نامردی کی صورت میں مل گئی۔"

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا۔ "ولی سے لیکر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے لکھتے چلے آئے ہیں۔ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو۔"

استغاثے کی طرف سے سوال کیا گیا۔ "کیا ادب مقصود بالذات ہے۔"

عابد صاحب نے جواب دیا۔ "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقیدِ حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول اور فعل کا مطلب ہوتا ہے لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لئے بے شمار معیار ہوتے ہیں۔"

استغاثے کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا۔ "یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے —— میری ایک لڑکی جو فورتھ ایئر میں پڑھتی ہے۔ اس سے کئی بار "سیکس" پر علمی بحث ہو چکی ہے۔ جو اس کے نصاب کا جزو ہے۔" —— پھر آپ نے کہا۔ "خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلۂ خیالات ہوا۔ سب نے اس کو بہت سراہا۔"

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور تھے آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" فحش نہیں ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک لفظ فحش کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے سے بُرا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ ڈی سابق ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے۔ ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے۔ بُرے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔"

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی نامردی طاری ہو سکتی ہے۔

ان تین گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہوئے۔ چونکہ یہ خاصے طویل تھے اور ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لئے وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا۔ "میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر" — لیکن بہر حال انہیں

اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑتا تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھ میں سگرٹوں کا ڈبہ غالباً کریون اے کا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی۔ "یہ گھر نہیں ہے ـــــ عدالت ہے۔" میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "لیکن حضور میں پی تو نہیں رہا ہوں۔" آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا۔ "خاموش رہو۔ ڈبہ اپنی جیب میں رکھو۔" میں نے حکم کی تعمیل کی ـــــ مجسٹریٹ صاحب درجہ اوّل نے میز پر سے اپنا سگرٹ ٹن اٹھایا اور ایک سگرٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا ـــــ اور میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔

اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے۔ کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علیل تھا۔ ہمیں تاریخ مل گئی۔ اس تاریخ پر میاں صاحب موصوف تشریف نہ لائے۔ ان کا لڑکا ولائت سے واپس آ رہا تھا۔ وہ کراچی، اس کے استقبال کے لئے چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مؤدبانہ گذارش کی۔ کہ ہمیں تاریخ دے دی جائے اس لئے کہ ہمارا وکیل موجود نہیں ـــــ آپ نے اس سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔

میں بہت سٹپٹایا۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔ اے، ایل۔ بی، پی۔ اینچ ڈی، ڈی۔ ایس۔ سی (ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے سولین افیسر) تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کیا کروں۔ مگر شاید اس لئے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور

باپ سب جج تھے۔ دو بڑے بھائی بیرسٹر ہیں اور اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا۔ میں نے میاں تصدق حسین صاحب خالد کی جگہ سنبھال لی اور اپنے گواہ نمبر۲ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے۔ "تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے —— تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے" —— میں ڈٹا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کا بیان آدھا ختم ہوا تھا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل کالے کوٹ پہنے بڑے چست۔ بڑے بانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور جس کا رنگ باقی دو کے مقابلے میں کسی قدر سانولا تھا، میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے سانس لینے کا موقعہ ملا تو اس نے میرے کان میں کہا۔ "منٹو صاحب کیا ہم آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں"۔ میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا۔ "جی ہاں آپ کر سکتے ہیں" —— چنانچہ پتلی پتلی مونچھوں والے اس نوجوان وکیل نے پیروی شروع کر دی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا۔ "آپ کیسے؟"

وکیل نے مسکرا کر جواب دیا۔ "حضور میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب" —— میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تین ساتھی بھی حصہ لینے لگے —— ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش لڑکپن تھا۔ وہ جو کالج کے زندہ دل طلبا میں ہوتا ہے —— مجسٹریٹ بھنا گئے۔ آپ نے ان تین سے پوچھا۔ "آپ حضرات

کیوں بیچ میں بول رہے ہیں"۔۔۔ انہوں نے جواب دیا۔ "حضور ہم ملزموں کے وکیل ہیں ۔۔۔ کیوں منٹو صاحب"۔۔۔ میں نے پہلے کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا میں اسے مختصراً پیش کرتا ہوں ۔۔۔ آپ نے فرمایا" ٹھنڈا گوشت پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا پژمردگی اور افسردگی، یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ شہوانی ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا ۔۔۔ ایشر سنگھ کا کردار پیش کرنے کے لئے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے۔ مگر شاید فن کار نے اسے مناسب سمجھا ہو۔ مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی ۔۔۔ اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہو سکتی اگر فن کار صحیح فن کار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فن کارانہ ہے۔"

پروسی کیوٹر صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ بہت بانکے۔ کجکلاہ۔ گردن میں ہلکا سا شاندار خم۔ آنکھوں پر "رم لس" چشمہ جسے وہ بار بار اپنی ناک سے اتارتے اور جماتے تھے۔ آپ نے ازراہِ تمسخر کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب برس پڑے۔ اس زور سے کہ دوسرے کمرے میں صوفی تبسم صاحب کرسی پر اچھل کر باہر نکل آئے بہرحال معاملہ ٹل گیا۔

پروسی کیوٹر صاحب نے جن کا نام غالباً محمد اقبال تھا ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "نفسِ مضمون

کے لحاظ سے مختلف ادبا کو مختلف القاب دیئے گئے ہیں۔ مثلاً " راشد الخیری کو مصورِ غم اقبال کو مصورِ حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت...... آپ......"

ڈاکٹر صاحب نے اقبال صاحب کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں "ٹھنڈا گوشت" کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا۔"

اب کرنل فیض احمد فیض، اڈیٹر پاکستان ٹائمز کی باری آئی۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیرِ نظر ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔"

جرح کے جواب میں فیض صاحب نے کہا۔ "میری بھپیاں لے رہے تھے"۔۔۔ اگر موضوع تقاضا کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ "منہ بھر بھر کے بوسے لئے"۔ "چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا" یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں۔"

فیض صاحب کے بعد صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تشریف لائے ۔۔۔۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لوگوں کے

اخلاق کو خراب نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعض فقرے الگ ہو کر فحش ہوں اور بعض نہ ہوں انسانی جذبیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے"

جرح کا جواب دیتے ہوئے صوفی صاحب نے فرمایا۔ "کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہو سکتا۔ جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کے کبھی فحش نہیں ہوتا"

اقبال صاحب نے اپنی ناک پر سے کئی مرتبہ جلدی جلدی "رم لس" چشمہ اتارا اور جمایا۔ وہ صوفی صاحب کو گھیر گھار کر اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے تھے۔ مگر صوفی صاحب طفلِ مکتب نہیں تھے۔ بیس برس سے استادی کرتے چلے آئے تھے۔ اقبال صاحب کے جال میں نہ پھنسے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے صاف کہہ دیا۔ "دیکھیے صاحب آپ لاکھ الٹ پھیر کریں لیکن میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا ہے"

اقبال صاحب نے سوال کیا ——— "اگر کسی تحریر۔ افسانے یا ادب پارے کے نتائج مخرب الاخلاق ہوں مگر مصنف کا مقصد تخریبِ اخلاق نہ ہو تو آپ اس افسانے کو فحش کہیں گے یا نہیں"

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "نہیں ——— اس لئے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات شامل ہونگے نہ کہ مصنف کا مطلب۔ تخلیقِ ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ یہ تخلیق اوروں کے لئے بھی ہوتی ہے"

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا۔ "اگر اس تصنیف سے لوگوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی یا نہیں؟"

صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا۔ "وہ بری الذمہ ہے۔"

اقبال صاحب نے عاجز آکر پوچھا۔ "آخر مخرب اخلاق تحریر کیا ہے۔؟"

صوفی صاحب نے جواب دیا۔ "وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریب اخلاق ہو ——"

اقبال صاحب نے ناک پر اپنا "رم لس" چشمہ جمایا اور گردن کو ذرا اور خمیدہ کرکے جرح بند کردی۔

ڈاکٹر آئی۔ لطیف ہیڈ آف دی سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ ایف۔ سی کالج لاہور بلائے گئے —— میں نے ان کا نام سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا —— کالا رنگ۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تیکھی مونچھیں نظر آئیں۔ آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا۔ "میں نے "ٹھنڈا گوشت" ابھی ابھی پڑھا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ افسانہ ایک پوپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کسی سائنٹیفک رسالے میں کیس ہسٹری کے طور پر مردمی اور نامردی کی تائید یا تردید میں چھپتا تو اس پر

فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا ۔۔۔ جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بولنے ہیں ان کو برا سمجھتا ہوں۔ لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھیں گے۔"

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا۔ "مسٹر منٹو کون ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جناب یہ خاکسار ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی تیکھی مونچھیں تھرتھرائیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے۔ وکیل صاحب نے میرے کان میں کہا۔ "منٹو صاحب آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہٹایئے۔"

لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا۔ "افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا۔ لڑکا۔ لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ایسی طباع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں یہ افسانہ پڑھ کر مشتعل ہوں گی۔"

جرح ختم ہوئی۔ ڈاکٹر لطیف صاحب میرے پاس آئے۔ ہاتھ ملایا اور کہا۔ "آپ نے مجھے گواہی کے لئے بلایا تھا تو کم از کم مل لئے ہوتے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "انشاء اللہ اب ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

اب میں ان چار نوجوان وکیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز

میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں۔ تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے۔ دوسرے تین تھے۔ مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خاں۔ آپ لوگوں کو بار روم میں معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لئے چلے آئے ــــ میں نے ان کا شکریہ مناسب موزوں الفاظ میں ادا کیا۔ شیخ خورشید احمد نے کہا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں ـــــ لیکن داد دیجئے کہ میں نے آپ کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھا کیا دیکھا تک نہیں"ــــ ہم سب خوب ہنسے ــــ شیخ نے کہا۔ "اور میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ مسٹر اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا۔"

ہماری طرف سے سات گواہ اب تک پیش ہوئے تھے۔ بقایا گواہوں کو بلوانے کے لئے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو مسترد کر دی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے عدالت کی طرف سے چار گواہ طلب کئے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی۔ شورش کاشمیری، ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

کئی تاریخیں بھگتیں مگر یہ حضرات جمع نہ ہوئے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آ گئے تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لکچر پلانا شروع کر دیا۔ کہ میں ایسے غلیظ۔ فحش اور واہیات افسانے لکھتا ہوں۔ میں خاموش سنتا رہا اس لئے کہ مولانا

کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پرشور طریقے پر ملے۔ ابوسعید بزمی نے مجھ سے ایک سگرٹ لیا اور سلگا کر ٹہلنے لگے۔ آواز پڑی تو حاضرِ عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانبِ عدالت شمس العلماٗ مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور تھے ـــــ آپ نے فرمایا "ٹھنڈا گوشت" کسی مسجد میں یا کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سننا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو اپنا سر سلامت لے کر نہ جا سکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔

میں نے مولانا سے چند سوال کئے تو آپ نے جواباً کہا۔ "یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا۔ مثنوی گلزارِ نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے ـــــ فسانۂ عجائب۔ مثنوی بہارِ عشق۔ مثنوی فریبِ عشق اور الف لیلیٰ میں جو فحش حصے ہیں وہ فحش ہیں۔ حکایت خانم و کنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں آتا ہے لیکن میں نے نہیں پڑھا ـــــ جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا۔"

جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب سناؤں مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کر کے ان کو چھوڑ دیا ـــــ اب آغا شورش کاشمیری ولد آغا نظام الدین۔ اڈیٹر ہفتہ وار "چٹان" مونچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر

آپ کھل کے مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا "جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے میں نے "ٹھنڈا گوشت" سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کیے۔ جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اس کے پیشِ نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شائع نہیں کروں گا۔ میرا مدرسۂ فکر اسے گوارا نہیں کرتا۔"

استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا "اس سے اوباش قاری کو ترغیب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو جن کا رجحانِ طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو۔"

ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی گئی ــــــ ابو سعید بزمی اڈیٹر احسان لاہور پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخربِ اخلاق قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "افسانہ معنی و مطلب کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے۔"

میں نے بزمی سے پوچھا۔ "کیوں حضرت۔ یہ بتایئے کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے" ــــــ آپ نے جب "جی ہاں" کہا۔ تو مجسٹریٹ صاحب نے حیرت سے پوچھا "میری عدالت میں" ــــــ بزمی صاحب نے پھر جواب دیا۔ "جی ہاں" ــــــ مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگایا۔ اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانبِ عدالت پیش ہوئے یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے۔ لیکن ہے ادبی نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لئے ضروری ہیں کچھ غیر ضروری۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کو ناشائستہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں فحش اس لئے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق میں واضح نہیں ہوں —— میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے ان کے لئے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے۔ جس شخص کی طبع میں میلانِ بدکاری نہ ہو اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہو گی۔ جنسی ترغیب نہیں ہو گی۔ "ٹھنڈا گوشت" کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں۔ یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔"

عدالت کی تمام کارروائی ختم ہوئی۔ اب فیصلہ باقی تھا جو میاں اے ایم سعید صاحب سماعت کے دوران میں کئی مرتبہ زبانی سنا چکے تھے۔ شیخ خورشید احمد کو یقین تھا کہ ہم سب کو جرمانہ ہو گا —— فیصلے کی تاریخ سولہ جنوری (یہی سال) مقرر ہوئی۔ نصیر انور بالکل بے پروا تھا۔ ساری سماعت کے دوران میں وہ ہنستا مسکراتا رہا۔ عارف عبدالمتین البتہ سارا وقت بہت پریشان رہے۔ ان کی اس پریشانی کا باعث یہ بھی تھا کہ ان کے معمر والد بڑے ہراساں تھے۔

جب صفائی کی گواہیاں ختم ہوئی تھیں تو میں نے اپنا تحریری بیان داخل کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر مجھے اچھی طرح یاد ہے مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا تھا۔ "یہ بیان ہی ملزم کو سزا دینے کے لئے کافی ہے۔"

یہ بیان حسب ذیل ہے:-

میں افسانہ "ٹھنڈا گوشت" مطبوعہ ماہنامہ "جاوید" لاہور کا مصنف ہوں جو استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ افسانہ کسی بھی نکتۂ نظر سے ایسا نہیں ہے۔

فحاشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ "ادب" ہرگز ہرگز فحش نہیں ہو سکتا۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ افسانہ ایک ادیب کی تصنیف ہے۔ جو ادبِ جدید میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی تصانیف ہیں اور وہ مضامین ہیں جو قریب قریب ہر ادبی رسالے میں اس کے فن پر شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے تین مرتبہ چند افسانوں کے بارے میں شبہ ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں چنانچہ مجھ پر مقدمے چلے۔ سزائیں ہوئیں۔ لیکن اپیل کرنے پر ہر بار سیشن کورٹ میں مجھے اور میرے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کیا گیا۔

میرے ایک مقدمے کے سلسلے میں مسٹر ایم۔ آر بھاٹیہ اڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں۔ جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال

کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے، ایل کپور پروفیسر ڈی اے وی کالج۔ راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی لطیف پروفیسر ایف۔ سی کالج جو بطور گواہانِ صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے۔ کہ مضمون (بو) میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے بلکہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثے کے گواہ نمبر چار بشیر نے دورانِ جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں ڈالتا۔

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے (ماتحت عدالت کے فاضل جج) نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں۔ جن کے لئے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں —— ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے —— حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لئے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستوری

کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیرِ بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لئے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔"

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا ہے۔ اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیئے۔

کوئی لٹریری پیس یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ آرٹسٹ ہو سکتا ہے اپنا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

"ٹھنڈا گوشت" کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا سنا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں۔ یہ کام ادبی نقادوں کا ہے۔ اور انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں، پرکھیں۔ مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ مصنف کی طرف سے افسانوی ادب میں اچھا بُرا، جیسا بھی ہے یہ ایک اضافہ ہے۔ لیکن اس صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے۔ آیئے ہم اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی

پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جیسا کہ ظاہر ہے ایک افسانہ ہے۔ جس کا عقبی منظر یوں تو گذشتہ فسادات ہیں لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے۔ اور انسانی نفسیات کا "جنس" سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور اس کی داشتہ یا بیوی کلونت کور کا۔ دونو ٹھیٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں۔ دونو جنسی لحاظ سے بہت تگڑے ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ایشر سنگھ کو جنسی تشفی صرف کلونت کور ایسی عورت ہی سے اور کلونت کور کو جنسی تشفی صرف ایشر سنگھ ایسے مضبوط اور توانا مرد ہی سے مل سکتی تھی۔ دونو کی جنسی زندگی بڑی ہموار تھی۔ لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے۔ جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی جنسی محبّت میں پہلی سی توانائی نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رُخی برت رہا ہے۔ کسی اور عورت سے اس نے ناطہ جوڑ لیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ سردار ایشر سنگھ ایک زبردست نفسیاتی ردِّعمل کا شکار تھا۔ جس کے باعث اس کی جنسی توانائی قریب قریب مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ اٹھا لایا تھا کہ تبدیلی کے طور پر وہ اس سے جنسی حظ اٹھائے۔ مگر جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ اس کی تپی ہوئی

شہوانی خواہشات کے سامنے ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا۔ اس کا ایشر سنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہؤا کہ نفسیاتی طور پر نامرد ہوگیا۔

اگر ایشر سنگھ کو ٹھنڈی عورتوں سے سابقہ پڑا ہوتا۔ اگر ایشر سنگھ خود ٹھنڈا مرد ہوتا تو اتنا زبردست نفسیاتی ردِ عمل نہ ہوتا۔ مگر جیسا کہ اس کا کردار پینٹ کیا گیا ہے وہ جنسی لحاظ سے بہت ہی توانا تھا اور اس کا جنسی رشتہ ایک ایسی عورت سے تھا جو ہر لحاظ سے اس کا ہم پایہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کیے گئے حادثے نے اسے جنسی لحاظ سے بالکل نکما کر دیا۔

یہ بات یہاں قابلِ غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جب وہ لڑکی کی ٹھنڈی لاش پر جھکا تو اس کی مردانگی غائب ہوگئی۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے بطن میں جو کچھ بھی ہے ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بیّن ثبوت ہے کہ افسانہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں شہوت کی گرم لہریں نہیں دوڑائے گا۔ جو حادثہ ایشر سنگھ کو پیش آیا وہ کیسے کسی قاری کو شہوانی جذبات کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

ایشر سنگھ کا اندازِ گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی عام روزمرّہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اسکی حرکات

غیر فطری نہیں۔ اسی طرح کلونت کور کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

استغاثے کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ایشر سنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں اصل میں گالی نہیں ہیں۔

میں یہاں گالی کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب، مرزا شہاب الدین خاں صاحب کے نام ایک رقعے میں لکھتے ہیں۔

"یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں۔ خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دیئے ہیں ـــــ اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کسی ملعون نے جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیئے ہیں۔"

(اردوئے معلیٰ۔ صفحہ ۲۱۷)

مرزا شہاب الدین کے نام ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے۔

"میاں وہ قاضی مسخرہ تو چوتیا ہے۔"

(اردوئے معلیٰ۔ صفحہ ۲۱۸)

گالی کے یہ نمونے تو ہو گئے۔ لیکن اگر کوئی شخص گفتگو کے دوران میں یہ کہے۔ "میں بھی عجیب چوتیا ہوں کہ آپ یہاں اور میں آپ کو لاہور ڈھونڈتا پھرا۔" تو ظاہر ہے لفظ "چوتیا" گالی نہیں۔ "سالا" ہمارے یہاں بہت بڑی گالی متصور کی جاتی ہے۔

لیکن بمبئی میں لفظ "سالا" کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں آپ کو وہاں ایسے کئی فقرے سننے میں آئیں گے۔

"ہمارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا"

"سالا ہم سے مِسٹیک ہو گیا"

"سالا کیسی بات کرتا ہے"

ماں بہن کی گالی یو۔پی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے۔ اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ ایشر سنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ اس لئے استغاثے کے فاضل وکیل کا اس نکتے پر زور دینا بالکل بیکار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ایشر سنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں جا گرتا۔

سوال ہے۔ جو چیز جیسی ہے اسے من و عن کیوں نہ پیش کیا جائے ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے ـــــ حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں ممد و معاون ہو سکتا

ہے ـــــ ہرگز نہیں ـــــ پھر ایشر سنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی۔ افسانے کا موضوع گھناؤنا سہی لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے۔ اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردِّ عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے فحش اور شہوت کو ابھارنے والی سمجھی جا رہی ہے۔ اور یہ لطیفہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی رہی سہی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایشر سنگھ کو اپنی چری ہوئی گردن کا بالکل احساس نہیں تھا اس کو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی رہی ـــــ کہ وہ ایک ٹھنڈی لاش سے زنا کرنے والا تھا۔

فرانس میں مشہور ناول نگار فلابیئر کی تصنیف "مادام بوواری" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینار نے فاضلانہ بحث کے دوران میں کہا۔

"حضرات! یہ کتاب جو بقول وکیل استغاثہ شہوانی جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ موسیو فلابیئر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متین اور ملول مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں جس کے خلاف وکیل استغاثہ نے ہیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہر اگلا ہے ـــــ میں پھر دہراتا ہوں کہ فلابیئر کی فطرت میں بے انتہا سنگینی، شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔"

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت۔ اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ اردو کے جدید ادب سے جو ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں ان کو میرے ادبی مقام کا علم ہے

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں فلابیئر کی فطرت کی بے انتہا سنگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بے پناہ ملال سے بھرا پڑا ہے۔ اور جب سوال ملال کا ہو تو شہوت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کے اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔ رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے "دھواں" کے سلسلے میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"تحریر و تقریر میں۔ شعر و شاعری میں۔ سنگسازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیئے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے۔ اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر۔ وہ تقریر۔ وہ شعر۔ وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔"

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیرِ بحث افسانے میں نہیں۔ میں افسانے کا تجزیہ اوپر کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں۔ تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیئے۔ افسانہ "دھُواں" ہی کی صفائی کے سلسلے میں میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

"ایک مریض جسم۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے جو لوگ روحانی۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہیں کے لئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصوّر تصویر بناتا ہے۔

"میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نورمل انسانوں کے لئے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے

ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے
کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بھی دوسرے ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لئے ہے۔ ایسے دماغوں کے لئے نہیں ہے۔ جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی شہوت کرید لیتے ہیں۔

اگر کوئی عورت لوہے کی مشین کی حرکت سے شہوانی لذت حاصل کر لیتی ہے تو کیا اس لوہے کی مشین یا اس کی حرکت پر سفلی جذبات برانگیختہ کرنے کا الزام دھرا جائے گا ــــــ دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے بھی شہوانی لذت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کا علاج ہونا چاہیئے۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جوئیس کی تصنیف "یولی سیز" کو فحاشی سے بری کرتے ہوئے جج وولزے نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

"ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہو گا کہ اوسط درجے کے جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی "معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان" کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے جیسے عدالتِ خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت

ہوتی ہے۔ یا رجسٹری کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق "فن کے ماہر" کی۔"

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کیلڈول کی تصنیف "گوڈز لٹل ایکڑ" کو فحاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

"مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے۔ اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں بیباکانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں ـــــ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے۔ مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بیباکانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے

کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیئے۔

کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چمٹے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں کہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا ــــ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابلِ گرفت ہوسکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غالب۔ میر۔ ارسٹوفینز۔ چاسر۔ بوکشیو۔ بلکہ کتابِ مقدس تک کے بعض مقامات کو قابلِ تعزیر گردانا جاسکتا ہے۔ تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لئے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ استغاثے کی طرف سے میری تصنیف "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔ افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی۔ بیان میں اگر کوئی سقم تھا۔ انشا میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہوجاتا اور میں کچھ حاصل کرتا۔ لیکن میں یہاں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعے سے لوگوں کے شہوانی جذبات ابھارے ہیں ــــ اس کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں ملفوف ہونے کے بجائے شہوت سے ملوث کیسے ہوسکتا ہے۔

اور بھی حیرت ہے کہ ایشر سنگھ کو جو ہولناک سزا ملی وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں شہوانی جذبات کیسے بیدار کرسکتی ہے۔

سولہ جنوری آن پہنچی۔ شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ نصیر انور حسبِ معلوم بے پروا تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچہری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا۔ لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا۔ "بھائی جان۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں یہ سن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آ گئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "منٹو صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا ہو گا؟" میں نے جواب دیا۔ "وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔"

مجسٹریٹ صاحب آ چکے تھے مگر فیصلہ سنانے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ پانی پی پی کر ہمارے پیٹ اپھر گئے۔ مگر آواز نہ پڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے۔ مگر میاں اے۔ ایم سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں —— تھوڑی دیر کے بعد پتا چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں۔ یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں اور یہ کہ انہوں نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ غرض جتنے منہ

اتنی باتیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مخبر پکی خبر لایا۔ ایک طرف لے جا کر اُس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ "میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں —— جلدی جلدی میں دیکھا ہے۔ صرف چند آخری سطریں۔ آپ کو یقیناً سزا ہو گی۔ اور جرمانہ بھی —— آپ کے نام کے آگے یہ لکھا تھا۔ And Sentence him to undergo..... اس کے آگے جگہ خالی تھی۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہو گا۔ میں جاتا ہوں اور ضامن کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں سوچنے لگا۔ سزا کتنی ہو گی۔ ایک ماہ کی۔ دو ماہ کی یا چند دنوں کی؟ میں نے کسی سے بات نہ کی البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً ضمانت کے کاغذ تیار کر لئے اور مجھ سے کہا۔ "گھبرایئے نہیں منٹو صاحب۔ سزا زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہو گی۔" لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویشناک لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا نہ ہو وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے۔"

یہ سن کر مجھے بہت تشویش ہوئی۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب کا رویہ شروع ہی سے مخاصمانہ رہا تھا۔ لیکن کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ خاموش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے شیخ سلیم کو ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ مگر شیخ بیچارہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا، لیکن تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا۔ "کچھ فکر نہ کرو بھائی جان —— میں ٹیکسی لے کر وہاں جیل میں

پہنچوں گا ــــ روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں ایسے معاملے نبیڑنا جانتا ہوں ــــ میرا خیال ہے آپ اس وقت ایک بڑا پگ لگا لیجئے"

میں نے کہا: "نہیں شیخ صاحب ــــ شام کو"

شیخ صاحب نے کہا: "تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا"

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی ــــ ایک بج چکا تھا۔ شیخ سلیم۔ نصیر انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان پر بیٹھ کر "آلو چھولے" کھائے اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

نصیر انور اور عارف عبدالمتین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ جرمانے کا بندوبست کر لیں۔ تاکہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے ــــ شیخ سلیم جی پی کر اسکیمیں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولت مند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لئے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے بور ہو رہے تھے۔ شیخ سلیم کو غصہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی اور ضمانت دینے کے لئے کیوں لایا گیا۔ میں نے اُن سے کہا: "شیخ صاحب اگر آپ کو ضمانت دینے ہی کا شوق ہے تو دو ملزم اور موجود ہیں۔" شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے۔ میری یہ بات

ہنس کر مسکرا دیئے اور ایک پگ اور چڑھا کر اسکیمیں سوچنے میں محو ہو گئے۔ ان کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ منٹو کی شام خراب ہو جائے گی۔

پانچ بج گئے۔ تشویش اور تردد بڑھتا گیا۔ نصیر بالکل بے پروا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا نہیں۔ اس کی یہ بے پروائی قابلِ رشک تھی۔ عارف عبدالمتین کا حلق اب اتنا خشک ہو چکا تھا کہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا ــــ ساڑھے پانچ ہوئے تو ہمیں بلایا گیا۔ فوراً شیخ خورشید صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے آتے۔ ہم سب حاضرِ عدالت ہوئے۔

میاں اے۔ ایم سعید دانتوں تلے قلم دبائے۔ سامنے میز پر فیصلے کے کاغذ رکھے سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ شیخ خورشید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیخ سلیم کا رنگ زرد تھا۔ عارف عبدالمتین بار بار ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا ــــ نصیر انور اُسی طرح بے پروا تھا۔

پریس رپورٹر موجود تھے۔ کاغذ پنسل ہاتھ میں لئے وہ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحات مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد میاں اے۔ ایم سعید صاحب کھنکارے۔ دانتوں کی گرفت سے قلم آزاد کیا۔ نب کو روشنائی دکھائی فیصلے کے کاغذ الٹ پلٹ کئے۔ اور بہت سوچ سوچ کر ایک کاغذ پر خالی جگہیں پُر کیں ــــ اس کے بعد میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ــــ تین مہینے قید

بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ ـــــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قید بامشقت ـــــ شیخ سلیم کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ اُس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے تسلی دی گویا یہ کہہ رہا ہے۔ "کچھ فکر نہ کرو۔ میں وہاں جیل میں ضرور پہنچوں گا۔"

میں یہ سوچنے لگا تھا کہ مجسٹریٹ ضمانت قبول کرے گا یا نہیں ـــــ تھوڑے وقفے کے بعد میاں اے۔ ایم سعید نے دوسری خالی جگہیں پُر کیں اور بقایا دو ملزمین کے بارے میں فیصلہ سنایا ـــــ تین تین سو روپیہ جرمانہ ـــــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم قید بامشقت۔

میں نے جرمانہ داخل کر دیا۔ شیخ خورشید صاحب نے میری ضمانت کے کاغذ پیش کیے تو میاں اے۔ ایم سعید نے کہا۔ "میں اگر ضمانت منظور کرتا ہوں۔ تو سزا کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔

شیخ خورشید صاحب نے یہ استدلال پیش کیا۔ "آپ کا ارشاد درست۔ ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے۔ جو اپیل منظور ہونے کی صورت میں یقیناً واپس مل جائے گا۔ لیکن وہ دو تین دن جو ضمانت ہونے سے پہلے میرا مؤکل جیل میں کاٹے گا۔ اپیل منظور ہونے پر کیا اُسے واپس مل جائیں گے۔"

استدلال بہت معقول تھا۔ مگر پھر بھی میاں اے۔ ایم سعید کچھ دیر اڑے رہے آخر میں کرم فرمائی کی اور میری ضمانت قبول کر لی۔

عارف عبد المتین کے والد صاحب نے اُن کا جرمانہ ادا کر دیا۔ اب رہ گئے نصیر انور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔" مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتکڑی لگاؤ اور جیل بھیج دو۔ نصیر انور اُسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ میرے پاس دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر مالک نیا ادارہ سے میں نے کہا کہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں۔ مگر ان سے نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتکڑیاں لئے نصیر کی پیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ ان کی جھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ باہر پولس وین تھی۔ یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے۔ ایم سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں۔ جرمانے کا روپیہ وہ کل صبح داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا۔ "ان کی ضمانت کون دے گا؟"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جو اب تک نشے میں دھت ہو چکے تھے۔ شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا۔ "نصیر صاحب کی ضمانت میں دیتا ہوں۔"

—— میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر عدالت کو معلوم ہو گیا کہ شیخ صاحب پئے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا —— مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لئے جائیں گے اور سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا —— میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔

بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا کہ نہیں لیکن خیریت گذری۔ نصیر انور کی ضمانت ہو گئی ــــ شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے۔ "اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچا لیا" یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو کہ آخری تھا۔ "چلو بھئی چلیں۔ کہیں دکان بند نہ ہو جائے"

نصیر انور بہت ممنون و متشکر تھا۔ بار بار شیخ سلیم کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ شیخ صاحب نے اُس سے کہا، "شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے آپ میرے دوست کے دوست ہیں"

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میاں اے۔ ایم سعید کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ جب نہ ملی تو درخواست کے ساتھ نو "پہیئے" لگائے ــــ نقل مل گئی۔

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا اُردو ترجمہ درج ہے:۔

فیصلہ

ایک اُردو رسالہ بہ نام "جاوید" کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر نصیر انور کو معہ ایک مصنف مسمّی سعادت حسن منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مؤخرالذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے، کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے

کہ انہوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سیّد ضیاالدین مترجم پریس برانچ حکومتِ پنجاب کے علم میں آیا۔ جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومتِ پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومتِ پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لئے قانونی کارروائی کے لئے کہا۔

اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا۔ اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں۔ لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش ہے یا نہیں۔

استغاثے نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں (Ex. P. F) کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے، اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا۔ جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندہ طرزِ بیان، اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا۔ اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کئے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ طے کرنے کے لئے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیرِ بحث کہانی فحش ہے یا نہیں ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے، جس سے فحاشی کی تمیز کی جا سکے۔

۳ کیو۔ بی (۱۸۶۸ء) میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک بورن جی۔ جے صفحہ ۳۶۰ (یا صفحہ ۳۷۱) پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا اس قسم کا الزام زدہ مواد جو اِن لوگوں کو بداخلاقی اور بدچلنی کی ترغیب دے جن کے اذہان اس قسم کے مخربِ اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے۔ وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لئے ضرر رساں خیال کی جائیں۔ جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے، بالکل بے ضرر سمجھی جا سکتی ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسی دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے۔ خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے زیرِ بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا۔ اور اس اثر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے، یہ جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے صرف ایک معیار ہے۔ اُس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ رجحان ہے، (یہ الزام زدہ مواد میں موجود ہے) جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ یہ معیار بھی قارئین کے اخلاق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کئے اور اپنا کیس بند کر دیا۔

گواہ استغاثہ ۱۔ مسٹر محمد یعقوب منیجر کپور پرنٹنگ پریس۔ ۲۔ شیخ محمد طفیل ۔۔۔ ۴۔ مرزا محمد اسلم۔ گواہ استغاثہ نمبر ۵ خدا بخش نے ان امور کے متعلق شہادت دی۔ جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۳ سید ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیرِ بحث کہانی فحش ہے۔ تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہرِ ادب سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں قانونِ شہادت کی دفعہ ۴۵ کی رُو سے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس لئے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے۔ استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتداً پیش کیا گیا، خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہو گیا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کئے ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیرِ بحث تحریر فحش نہیں ہے صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور

ماہروں کو بطورِ عدالتی گواہ بلوایا۔

بیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیرِ بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے، جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے۔ جہاں تک یہ ادب کے مروجہ معیاروں، اظہار کی شستگی، سوقیانہ پن، اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز "فحاشی" کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ ۱۔ مسٹر عابد علی عابد ۲۔ مسٹر احمد سعید ۳۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۴۔ ڈاکٹر سعید اللہ ۵۔ فیض احمد فیض ۶۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ۷۔ ڈاکٹر آئی لطیف جیسے صاحبِ علم ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے فن کار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو۔ حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لئے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں۔ کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہو سکتا۔ وہ زیرِ بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابلِ گرفت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ اس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں، جو پیش کردہ کردار کے نوع کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے

یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی۔ عدالتی گواہ ع۱ مولانا تاجور ع۲ آغا شورش کاشمیری ع۳ مولانا ابو سعید بزمی ع۴ ڈاکٹر تاثیر بھی اُسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ زیرِ بحث کہانی 'بُرا ادب' ہے اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ ع۲ ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیرِ بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی۔ لیکن ایک مقبولِ عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔

صفائی کے گواہ ع۵ کرنل فیض احمد فیضؔ کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کئے گئے ہیں۔ جن سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔

عدالتی گواہ ع۱ مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی۔ اور کہا کہ انہوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربہ میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ ع۴ ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے، جو شہوانی حرص کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شہوانیت کی لگام شیطان کے ہاتھ

میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی شہوانیت، نفس پرستی اور سوقیانہ پن زندگی میں موجود ہے اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوقہ سے، جسے بہت شہوت پرست دکھایا گیا ہے، وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تضمین کے ساتھ غیر شائستہ گالیوں کا استعمال عام کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے بعض پوشیدہ اعضا کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت جنسی بدتہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے۔

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے ردِ عمل قبول کر سکتے ہیں۔ تاہم میری رائے میں ایک اوسط نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا ردِ عمل اظہار، بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہو گا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزعمِ خود مشہور مصنف کی مثال پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ

اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

اس لئے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنیکا ذمہ دار ٹھیراتا ہوں، اور اسے زیرِ دفعہ ۲۹۲، پی۔پی۔سی تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اُس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑیگی۔

ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں، جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعتِ عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں۔ تاہم ان کے معاملے میں انکی کم عمری کے پیشِ نظر اور پھر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا، جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے۔ انہیں اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کرلی ہوگی کہ یہ قابلِ قبول ادب پارہ ہوگا، میں ان ہر دو ملزموں کے لئے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی، اس لئے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید بامشقت بھگتنی پڑے گی۔

دستخط

اے۔ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیشن میں اپیل دائر کر دی گئی۔ تاریخ ملنے پر ہم مہرالحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اس بنا پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور ہم شہر (یعنی امرتسر کے) تھے۔ مقدمہ مسٹر جوشوا اڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ دوسری پیشی پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہرالحق صاحب کو بھیج دیا ہے۔ یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے ـــــ مہرالحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خاں صاحب ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا۔ "یہ کیس چونکہ میرے لئے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے اس لئے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے وقت درکار ہے میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔"

شیخ خورشید احمد نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لئے دس جولائی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ "اچھا ہے۔ اس دوران میں میں بھی خوب تیاری کر لوں گا۔" لیکن انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے۔ داڑھی رکھتا ہے۔ نماز روزے کا پابند ہے۔ میں نے کہا۔ "ہٹایئے۔ یہاں نہیں تو ہائی کورٹ میں دیکھا جائے گا۔"

شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لئے مجھ سے کہا کہ میں اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے درج ذیل

سطور لکھ کر اُن کے حوالے کر دیں۔

یوں تو کہانی بظاہر جنسی نفسیات کے ایک نکتے کے گرد گھومتی ہے لیکن درحقیقت اس میں انسان کے نام ایک نہایت ہی لطیف پیغام دیا گیا ہے کہ وہ ظلم و تشدّد اور بربریت و حیوانیت کی آخری حدود تک پہنچ کر بھی اپنی انسانیت نہیں کھوتا۔ اگر ایشر سنگھ اپنی انسانیت کھو چکا ہوتا تو مردہ عورت کا احساس اُس پہ اتنی شدت سے کبھی اثر نہ کرتا۔ کہ وہ اپنی مردانگی ہی سے عاری ہو جاتا۔

اتنے شدید قسم کے اثر کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے مناسب و موزوں اور قریب از حقیقت دکھانے کے لئے ضروری تھا کہ ایشر سنگھ کو جنسی لحاظ سے عام مردوں کے مقابلے میں زیادہ قوی بتایا جاتا۔ چنانچہ مصنف نے کہانی میں جگہ جگہ اپنے قلم کی جنبش سے بقدرِ کفایت ایسا کیا ہے۔

ایشر سنگھ کے کردار کے جنسی پہلو کو اور زیادہ اجاگر کرنے اور اس طرح اُسے اس کے دردناک انجام کو قاری کے لئے قابلِ قبول بنانے کے لئے مصنف نے کلونت کور کا کردار پیش کیا ہے جو ایشر سنگھ ہی کی طرح عام عورتوں کے مقابلے میں جنسی لحاظ سے کہیں زیادہ قوی اور توانا ہے۔

اگر ایشر سنگھ ایک عام مرد ہوتا۔ اسی طرح اگر کلونت کور ایک عام عورت ہوتی تو یقینی طور پر افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ عام مرد پر جس کا جنسی تعلق

ایک عام عورت سے رہا ہو، ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہرگز ہرگز وہ نفسیاتی اثر نہیں کر سکتی جو ایشر سنگھ نے اپنے قوی اور توانا جنسی کردار کے باعث محسوس کیا۔۔۔ اور اس شدت سے محسوس کیا کہ وہ اس کے نیچے دب کر، بلکہ پس کر اپنی مردانگی کھو بیٹھا۔

شہوت ایک جذبۂ آتشیں ہے۔ انسان میں اگر یہ جذبہ بیدار ہو تو اس کے جسم میں گرم رو دوڑ جاتی ہے۔ اُس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اُس کا دل و دماغ تپ جاتا ہے۔ زیرِ بحث افسانے کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عنوان جو کہ معنوی اعتبار ہی سے ٹھنڈا ہے، قاری کے دل و دماغ میں کسی قسم کی گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی عورت جنسی لحاظ سے کمزور ہو تو ہم اُسے 'ٹھنڈی عورت' کہتے ہیں، یعنی ایسی عورت جو مرد میں جنسی خواہش پیدا نہیں کرتی۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں کلائمکس پیدا کرنے والی ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہے۔ ایسی ٹھنڈی لاش جو ایشر سنگھ جیسے پُرجوش شہوانی مرد کی ساری مردانگی پر برف کی سِل کی طرح گرتی ہے اور اُسے تخ بستہ کر دیتی ہے۔۔۔ ہم بخوبی سوچ سکتے ہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے والے قارئین پر جو یقیناً ایشر سنگھ کی طرح پُرجوش شہوانی انسان نہیں ہو سکتے، اِس کہانی کے انجام نے کس قسم کا اثر چھوڑا ہو گا۔۔۔ صفائی کے گواہ ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ ڈی، ڈی۔ ایس۔ سی نے اپنے تاثر کو مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا خوب بیان کیا ہے، افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود "ٹھنڈا گوشت" بن گیا۔"

جہاں تک نورمل انسانوں کا تعلق ہے، ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کا ردِ عمل بعینہٖ ایسا ہی ہوگا۔ یہ جدا بات ہے .... کہ وہ ڈاکٹر سعیداللہ صاحب کی طرح اپنے محسوسات کو بطریقِ احسن بیان نہ کر سکیں ـــــ ایبنورمل انسانوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو لاشوں سے بھی مباشرت کر سکتے ہیں۔

"ٹھنڈا گوشت" میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو کسی مقام پر بھی لذیذ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ اولاً اس لئے کہ ایسا انداز افسانے کے مقصد سے متصادم تھا۔ ثانیاً اس لئے کہ افسانے کا مصنّف "شہوت نگار" نہیں ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کوئی جوڑ دار آسن نہیں پیش کرتا۔ امساک کا نسخہ نہیں بتاتا۔ کسی خفیہ تصویر کی جھلک نہیں دکھاتا ـــــ "ٹھنڈا گوشت" البتہ ایک دردناک تصویر ہے ایک ایسے مرد کی جس میں انسانیت کی رمق، اُس کے کردار کی تمام ہولناکیوں کے باوجود باقی تھی ـــــ اس رمق نے گو اُسے انجام کار نامرد بنا دیا اور وہ اپنے جنسی رفیق کے حسد کے باعث نہایت ہی تکلیف دہ موت سے ہمکنار ہؤا، لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرتے ہوئے اُسے اپنی موت کا احساس بالکل نہیں تھا۔ اس لئے کہ اُس کے دل و دماغ پر صرف ایک چیز مسلط تھی ـــــ اُس لڑکی کی لاش کا یرف ناک ردِّ عمل، جس کے ساتھ وہ مباشرت کرنا چاہتا تھا۔

مرنے سے پہلے ایشر سنگھ کو اپنی بہیمیت کا احساس بھی ہؤا ـــــ اور یہ احساس

اُس کے اردگرد پھیلی ہوئی ظلمت میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ مصنف لکھتا ہے:۔

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی ـــــ" اس نے اپنے آپ سے کہا، "اور میں ـــــ اور میں ـــ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں ـــــ اسی کرپان سے!"

ایشر سنگھ نے اپنی کرپان سے چھ آدمی قتل کئے تھے، جو نفسیاتی حادثہ اُسے پیش آیا، اُس سے پہلے غالباً اُس نے کبھی غور نہ کیا ہوگا۔ کہ اُس کے ہاتھوں چھ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے ـــــ مگر اب وہ اپنے خون کا ذائقہ چکھتے ہوئے سوچتا ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ یہ سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جس کرپان نے میرا گلا کاٹا ہے، اُس سے میں چھ آدمی کاٹ چکا ہوں ـــــ اور جب وہ "چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں" کے ساتھ "بھینی یا" استعمال کرتا ہے تو کیا ہمیں اس گالی میں اُس کی روح کی دردناک چیخ سنائی نہیں دیتی ـــــ آپ سنیئے:۔

"اور میں ـــــ اور میں ـــــ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں ـــــ اسی کرپان سے!"

"یعنی ایشر سنگھ ـــــ تو درد اور تکلیف محسوس کر رہا ہے ـــــ لیکن جانتا ہے تو، کہ اس کرپان سے تو نے چھ آدمی مارے ہیں۔"

ایشر سنگھ سے ہم اس کے خیالات و محسوسات کے خوش اسلوب بیان کی توقع نہیں

کر سکتے۔ وہ ایک گنوار آدمی ہے، لیکن اس نے اپنے خام انداز میں سب کچھ بیان کر دیا۔۔۔۔ اور یہ خام انداز اپنی جگہ پر مناسب و موزوں ہے۔

ایشر سنگھ کی قوتِ مردمی سلب ہو چکی تھی، لیکن وہ اپنے اندر ایک نئی کروٹ محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔ اُس کے مقابلے میں کلونت کور کے دل و دماغ پر صرف ایک خیال مسلط تھا۔۔۔۔ اُس عورت کا جس نے اُس کے خیال کے مطابق اُس کے شوہر ایشر سنگھ کو موہ لیا تھا۔ وہ پوچھتی ہے: "کون ہے وہ حرامزادی؟"

مصنّف لکھتا ہے:۔

"ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک اُن میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ "گالی نہ دے اُس بھڑوی کو۔"

اِن چھ الفاظ میں کیا مصنف نے ایشر سنگھ کے سارے جذبات جمع نہیں کر دیئے وہ کلونت کور کو منع کرتا ہے کہ وہ اس عورت کو گالی نہ دے، لیکن خود اُسے "بھڑوی" کہتا ہے۔ دراصل اس گالی کا رُخ اس کی اپنی ذات کی طرف ہے۔ وہ بظاہر تو رحم اس عورت پر کھاتا ہے جس کو کلونت کور 'حرامزادی' کہتی ہے، لیکن درحقیقت اس کو رحم اپنی حالت پر آتا ہے۔

ذرا آگے چلئے تو سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

کلونت کور چلّائی: "میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔ "بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے اپنی گردن

پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔ "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے"

یہاں ہم ایشر سنگھ کو ایک فلسفی ــــ ایک خام فلسفی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اور اس خام فلسفی کے عقب میں ہمیں صرف ایک چیز نظر آتی ہے ــــ اس لڑکی کی ٹھنڈی لاش جس سے ایشر سنگھ جیسا "گرم مرد" مباشرت کرنا چاہتا ہے ــــ وہ مسکراتا ہے۔ صرف مسکرانے کے لئے نہیں۔ اُس کی مسکراہٹ دراصل اس کی حیرت کا مظہر ہے۔۔ چونکہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہؤا ہے، اس لئے وہ مسکرا دیتا ہے اور اپنے مضطرب ذہن سے فرار حاصل کرنے کے لئے خود سے کہتا ہے: "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے"

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو کسی انسان کے ساتھ پیش آسکتا ہے ــــ اس کو شہوانی جذبات کی برانگیختگی سے چونکر منسوب کیا جا سکتا ہے؟ ــــ کہانی، جس میں ایک قوی اور توانا مرد کی شہوت سرد ہو جاتی ہے، پڑھنے والوں کے سفلی جذبات کیسے مشتعل کر سکتی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" میں چند ایسے الفاظ اور فقرے موجود ہیں جن کو اگر افسانے کے جسم سے نوچ کر علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ ناشائستہ، اور غیر مہذب معلوم ہوں گے، مگر وہ افسانے کا لازمی جزو ہیں، جن کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا

کسی لفظ کو یا کسی فقرے کو اُس کے گرد کے ماحول کے ساتھ ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

اگر آپ "جگ سا پزل" میں سے ایک ٹکڑے کو اٹھالیں اور کہیں "یہ تو گدھے کی دُم ہے" تو ظاہر ہے کہ آپ اپنی رائے صحیح طور پر قائم نہیں کر رہے، اس لئے کہ اُس ٹکڑے کو اُس کے صحیح مقام پر رکھ کر "جگ سا پزل" کو من حیث المجموع دیکھنا پڑے گا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹکڑا دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ جڑ کر کسی خوبصورت عورت کے گلے میں پڑی ہوئی لومڑی کی کھال کی شکل اختیار کر جائے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ یا فقرے ہیں وہ کس قسم کے انسان کے منہ سے نکلے ہیں۔ ایشر سنگھ ایک گنوار اور غیر مہذب انسان ہے۔ اُس کے منہ سے ہم شائستہ اور مہذب گفتگو کی توقع نہیں کر سکتے۔

اب ہم گالیوں کی طرف آتے ہیں جو ایشر سنگھ کے مکالموں میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

ہم اس حقیقت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتے کہ اکثر مہذب اور غیر مہذب انسان (مرد اور عورتیں) اپنی روزمرّہ کی گفتگو میں گالیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایشر سنگھ اپنی گفتگو میں گالیاں بغیر کسی تکلف کے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کا مقصد گالی دینا نہیں۔ اکثر مقامات پر وہ گالی کو بطور تکیہ کلام کے استعمال کرتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"اور میں ——— اور میں ——— بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ گالی کا رخ نہ تو خود ایشر سنگھ کی طرف ہے نہ اُن چھ آدمیوں کی طرف جنہیں وہ قتل کر چکا ہے۔

"گلا چرا ہوا ہے ماں یا میرا۔"

ظاہر ہے کہ "گلے" کی کوئی ماں نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

"یہ کرڑی یا دماغ ہی خراب ہے"۔

اس کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ کی کوئی بیٹی نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

اسی طرح کلونت کور ایک جگہ کہتی ہے۔" یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے ؟"

دو مقامات پر ایشر سنگھ کہتا ہے۔" انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے' ——" انسان کرڑی یا بھی عجیب چیز ہے !" —— جیسا کہ صفائی کے گواہ مسٹر آئی لطیف نے کہا ہے، یہ گالیاں اپنی جگہ بہت نفسیاتی اہمیت رکھتی ہیں۔ افسانے کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری سمجھ سکتا ہے کہ ان گالیوں میں ایشر سنگھ کے مضطرب اور متجسس دل و دماغ کی کرب انگیز کیفیت جھلکیاں لیتی ہے —— وہ اپنی حالت کا صحیح جائزہ لینا چاہتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے اور آخرکار ان الفاظ میں فرار حاصل کرتا ہے۔" انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے —— انسان کرڑی یا بھی عجیب چیز ہے ::"

دس جولائی کا دن گرجتا ہوا آن پہنچا۔ مجھے سخت تشویش لاحق تھی۔ گھر میں سب دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ جج صاحب نے خاص کیس سمجھتے ہوئے چار گھنٹے بحث کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ میاں اے۔ ایم سعید کی طرح کہیں عنایت اللہ خان صاحب کا رویّہ بھی مخاصمانہ نہ ہو۔ کیونکہ ضبط کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میاں سعید صاحب کی عدالت میں کئی دفعہ ایسے موقعے آئے تھے کہ میں چھلک پڑوں مگر حیرت ہے میں نے کیسے ضبط کیا۔

ہم سب صبح حاضرِ عدالت ہوئے تو عنائت اللہ خان صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں شیخ خورشید صاحب سے کہا۔ ”معاف کیجئے۔ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ذرا یہ چھوٹے چھوٹے معاملے طے کر لوں“۔

ہم عدالت سے باہر نکل آئے —— عارف عبدالمتین خاموش تھا۔ شیخ خورشید صاحب بھی خاموش تھے۔ اپنے ساتھ وہ موٹی موٹی قانونی کتابوں کا ایک ڈھیر اٹھا کے لائے ہوئے تھے۔ اُن کا دماغ شاید ان کے حوالوں میں گم تھا۔ میں ہائی کورٹ کی سوچ رہا تھا۔ نصیر انور چھدری گھاس پہ رومال بچھا کر اُس پہ بیٹھا غالباً کوئی کشمیری گیت گنگنا رہا تھا۔

پونے گھنٹے کے بعد ہمیں بلایا گیا۔ ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جج صاحب کو سلام کیا —— عنایت اللہ خان صاحب نے گردن کی ایک ہلکی سی

جنبش سے اس کا جواب دیا۔ ہم ملزموں کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔ "کرسیوں پر تشریف رکھئے۔"

میں سمجھا کہ شاید یہ کسی اور سے کہا گیا ہے۔ مگر اُن کا روئے سخن ہماری طرف ہی تھا۔ مجھے بڑا خوشگوار تعجب ہُوا ــــــ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نصیر انور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بے حد مطمئن نظر آتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ بحث شروع ہوتی جج صاحب بولے۔ "میں نے اس کیس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ حضرات مطمئن رہیں۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے مثل میں سے صرف عدالت ماتحت کا فیصلہ پڑھا ہے۔ گواہیوں کا میں نے مطالعہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ البتہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بہت غور سے پڑھا ہے۔"

بحث شروع ہونے والی تھی کہ عنایت اللہ خاں صاحب نے استغاثے اور صفائی کے وکیلوں کی توجہ چند نکات کی طرف دلائی اور وضاحت چاہی۔ شیخ خورشید احمد خاموش رہے۔ ایک دو مرتبہ جج صاحب کی تائید میں البتہ کچھ ضرور کہا۔ پروسی کیوٹر صاحب کی تردید خود خان صاحب کر رہے تھے۔ قریباً آدھا گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرنے کے بعد آپ نے مسکرا کر کہا۔ "میں سعادت حسن منٹو کو اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی" ــــــ اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالت ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے۔ "کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا؟" ہم سب نے کہا "جی ہاں" اس پر جج صاحب نے کہا۔ "آپ بری ہیں۔

جرمانہ آپ کو پورے کا پُورا واپس مل جائے گا

میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا۔ "اٹھیئے حضرت۔ آپ بری ہیں"

عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چپڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ میرا انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔ شیخ خورشید صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خاں صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

اپیل بخلاف حکم مسٹر اے۔ ایم۔ سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور
مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء

دعوے زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی

سزا:۔ عارف عبدالمتین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتہ قید بامشقت سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قید بامشقت۔ نصیر انور تین سو روپیہ جرمانہ۔ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قید بامشقت۔

فیصلہ

یہ تین نوجوانوں عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک اپیل ہے۔ اوّل الذکر دونوں ایک اردو رسالہ "جاوید" کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام "ٹھنڈا گوشت" ہے، چھپنے کے لئے دی۔

انہیں بحکم میاں اے۔ ایم۔ سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور مؤرخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ مصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو جرمانہ بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۲۱ یوم مزید قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔

واقعات فیصلہ زیرِ اپیل میں موجود ہیں۔

مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدے دار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سیکرٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔

میں نے فریقین کے فاضل مشیرانِ قانون کو سنا ہے اور مثل کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جا سکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا

خیال ہے کہ مضمون زیرِ بحث کو فحش اور خاص طور پر خلافِ قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لئے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلافِ قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں اولاً یہ کہ لفظ "فحش" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیرِ بحث قابلِ اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جا سکتا ہے؟ میں نے قانونِ جرائم ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں۔ تن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے۔

فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے: "آیا فحاشی کے تحت الزام زدہ مضمون میں اُن لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بُری ترغیب دینے کا میلان ہے، جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی تصنیف عوام کے اخلاق کے لئے ضرر رساں ہے اور اندازہ کیا جائے کہ وہ جن کے ہاتھ میں پہنچے گی۔ ان کے ذہن میں بدچلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے اور شہوت پرستانہ قسم کے خیالات سجھائے تو اس کی اشاعت خلافِ قانون ہے خواہ ملزم کے پیشِ نظر کوئی در پردہ مقصد ہی کیوں نہ ہو جو معصوم حتیٰ کہ قابلِ تعریف ہو۔ کوئی چیز جو

شہوانی جذبات کو مشتعل کرے افحش ہے۔"

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لئے معاف نہیں کیا جاتا کہ باقی کی اشاعت ناقابلِ اعتراض ہے اور کہ یہ کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہؤا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس بیچی جاتی ہے۔ ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے؟ جن میں دونوں جنس کے جواں سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔

میرے خیال میں اس معاملے کو اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیئے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے سے ہرگز طے پانے والا نہیں۔ ہمیں اس پر غور نہیں کرنا کہ اس کے متعلق کچھ خاص او ممتاز ادیب کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتالنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے

تحریر و تصنیف کا کیا ردِ عمل ہوگا

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابلِ قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرضِ محال ہم حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے، ان کی شہادت کو عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے۔ جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اتفاقِ رائے پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا ردِ عمل بھی ضرور مختلف ہوگا۔ اور علاوہ اس کے کہ یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور بہت نمایاں حد تک مختلف ہوں گے

میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس "افسانوی آدمی" "پبلک کے ایک عام رکن" کے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیئے۔

یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لئے زیرِ بحث مضمون پر غور کرنا ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلّمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے زیرِ اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ "فحاشی" کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مختلف قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروّجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق "غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے لیکن سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیئے جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیرِ بحث مضمون کہیں کم قابلِ اعتراض ہے۔ متعدد "اسراری" مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور

کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں "تماشاؤں" کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں۔ جو زیرِ بحث مضمون سے کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسبِ معمول اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

چوما چاٹی اور بغل گیری ایک ایسی چیز ہے جو ہر روز سینماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر سچی کہانیاں" اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیرِ بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر ۹۳ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا نام ایشر سنگھ تھا، ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ لڑکی مر چکی ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے شہوانی جذبات کو اتنا سُن کر دیا کہ جب وہ بعد

میں کلونت کور کے پاس گیا تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سو سکے۔ حالانکہ اس نے اس مقصد کے لئے ابتدائی اقدام اٹھائے تھے۔

اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابلِ اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی ——— بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لئے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیرِ نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون "با ذوق" یا "بد ذوق"، "غیر مناسب" یا "سوقیانہ"، "ناشائستہ" یا "فحش" ہو سکتا ہے۔ اتنے تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جاتا ہو، قطعی طور پر "غیر شائستہ"، "غیر اخلاقی"، "ضرر رساں" اور بہت کچھ اور" ہونا چاہیئے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ جو میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابلِ اعتراض پیروں کی اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر "فحش" قرار دیتا۔

کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں۔ لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔

مجھے اس لیئے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے۔ لیکن میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ میں اسے "فحش" یا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا۔

چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنیئے۔ گیارہ جولائی کی صبح کو نذیر احمد چودھری مالک "نیا ادارہ" اور مدیر "سویرا" جو دوسرے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے "سویرا" میں شائع نہیں کرینگے تشریف لائے۔ بغل گیر ہو کر بڑی گرمجوشی سے مبارکباد دی اور کہا۔ "منٹو صاحب۔ اب "ٹھنڈا گوشت" عنایت فرما دیجئے۔ میں "نمرود کی خدائی" میں شامل کرلوں"۔

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب افیسر کیڈٹ مظہر علی خاں کا خط موصول ہوا ——

"مجھے امید ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب

زحمتِ مہرِ درخشاں

کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔
بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت"
سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارک باد
کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارکباد بہت دیر سے ہے۔ لیکن پھر بھی آپ
قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے۔ کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ
کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔

سنا ہے چودھری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر
نوک جھوک کرتے رہتے تھے اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ
کچھ بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن دنیا میں سرپھروں کی کمی نہیں۔ کوئی اور
صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔"

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریقِ
رحمت کرے۔ اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ان
کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھالے گا تو میں کہوں گا ——

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

سعادت حسن منٹو

لاہور۔ ۲۹ راگست ۱۹۵۰ء

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اُس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گذر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے تھل تھل

کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ گو سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، مگر اس کے قد و قامت اور خد و خال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لئے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گذر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی: "ایشر سیاں۔"

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلّائی: "ایشر سیاں۔" لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اُس کی جانب جاتے ہوئے بولی: "کہاں رہے تم اتنے دن؟"

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

کلونت کور بھنا گئی۔ "یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟"

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جواب

ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا: "جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟"

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ "کلونت!"

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ "ہاں جانی"، کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولہے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا: "یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔"

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے بڑے پیار سے پوچھا: "ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟"

"بُرے کی ماں کے گھر۔" ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتہً دونوں ہاتھوں سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا: "قسم واہگورو کی بڑی جاندار عورت ہو۔"

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا: "تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے؟ — شہر گئے تھے؟"

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں"

کلونت کور چڑ گئی: "نہیں تم ضرور شہر گئے تھے ـــــ اور تم نے بہت سارا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔"

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا؟ ـــــ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔"

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا: "دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا ـــــ ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟"

"تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔"

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟"

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے

تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اُس نے پُوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا: ”جانی میں وہی ہوں...... گھٹ گھٹ پا نچھیاں تیری نکلے ہڈاں دی گرمی......“

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی: ”تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟“

”برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔“

”بتاؤ گے نہیں؟“

کوئی بات ہو تو بتاؤں۔“

مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔“

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھُسے تو اُسے چھینک آگئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا: ”آجاؤ! ایک بازی تاش کی ہو جائے!“

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھُوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: ”چل دفان ہو۔“

ایشر سنگھ نے اُس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ”نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔“

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا: "لو، پھر ہو جائے ترُپ چال..."

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیص کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اُس کو اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اُس نے گھُور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا: "کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔"

کلونت کور اپنے بازو پر اُبھرتے ہوئے لال دھبّے کو دیکھنے لگی۔ "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا: "ہونے دے آج ظلم؟" اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لووں کو کاٹا، اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گُر اور جتنے داؤ اُسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی

طرح استعمال کر دیئے۔ پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا: "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتّا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "ایشر سیاں، وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے۔ اور جس نے۔ تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟"

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی "میں پوچھتی ہوں؟" کون ہے وہ چڈّو —— کون ہے وہ الفتی —— کون ہے وہ چور پتّا؟"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں"

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی —— کھا واہگورو جی کی قسم ——

کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں ــــ تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا ــــ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم..... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے بڑے دُکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دیوانی ہوگئی، لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اُتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پہ وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: "جانے دے اب کلونت! جانے دے۔"

آواز میں بلا کا درد تھا، کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔ "میری جان! تم نے بہت جلدی کی ــــ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔"

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا: "مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟"

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"اور میں...... اور میں...... بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں...... اسی کرپان سے......"

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی: "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا: "گالی نہ دے اُس بھڑوی کو۔"

کلونت چلّائی: "میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی: "بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا: "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔"

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی: "ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر۔"

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی ——
"مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں...... گلا چرا ہے ماں یا میرا...... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔"

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے

کلونت! میری جان...... میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا؟... انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے...... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا...... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیئے... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔"

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا "جس مکان پر...... میں نے دھاوا بولا تھا...... اس میں سات ...... اس میں سات آدمی تھے...... چھ میں نے...... قتل کر دیئے... اسی کرپان سے جس سے تُو نے مجھے...... چھوڑ اسے...... سُن...... ایک لڑکی تھی بہت ہی سُندر...... اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔"

کلونت کور، خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا: "کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی...... میں اُسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، "نہیں، ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا: "ہوں...... !"

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا...... راستے میں...... کیا کہہ رہا تھا

میں؟ ...... ہاں راستے میں ...... نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اُسے لٹا دیا ...... پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں "...... یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: "میں نے ...... میں نے پتّا پھینکا ...... لیکن ...... لیکن"

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی "وہ ...... وہ مری ہوئی تھی ...... لاش تھی ...... بالکل ٹھنڈا گوشت ...... جانی مجھے اپنا ہاتھ دے ......"

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

گولی

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں شفقت کی بیوی عائشہ اُن کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اُس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی: "عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں"

شفقت نے ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ "کون عزیز صاحب"

عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا۔ "ہائے، آپ کے اباجی کے دوست"

"اوہ —— عزیز چچا۔"

"ہاں، ہاں وہی"

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا۔ "مگر وہ تو افریقہ میں تھے"

عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی۔" ذرا آہستہ بات کیجیئے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں ۔۔۔ وہ افریقہ ہی میں تھے، لیکن جو افریقہ میں ہو گیا واپس نہیں آسکتا۔"

لو، اب تم انگلیس مین میخ کرنے۔"

"آپ تو لڑنے لگے" عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی:" عزیز صاحب افریقہ ہی میں ہیں، لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی کی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بر ڈھونڈ رہی ہیں"

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی:" عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو۔ آنے دو ۔۔۔ آؤ شفقت بیٹیا، آؤ ۔۔۔ تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے۔"

"آیا چچی جان" شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔" آداب عرض ہے چچی جان۔"

عزیز کی بیوی نے اُٹھ کر اس کو دعائیں دیں، سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی۔ شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی، دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجیہہ آدمی تھے۔ اُن کی یہ وجاہت ان لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں۔ نیلی۔ بال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں۔ چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

اُن کی ماں اُن سے مخاطب ہوئی۔ "بٹیا سلام کرو بھائی کو۔"
چھوٹی نے اُٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا۔ "تسلیمات۔"
شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروبی، ٹانگانیکا، دارالسلام کراتینا، یوگنڈا، ان سب کی باتیں ہوئیں۔ کہاں کا موسم اچھا ہے، کہاں کا خراب ہے، پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں —— پھلوں کا ذکر چھیڑا تو چھوٹی نے کہا۔ "یہاں ہندوستان میں تو نہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں۔"
"جی نہیں، بڑے اچھے پھل ملتے ہیں، بشرطیکہ موسم ہو۔" شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔
"غلط ہے" چھوٹی نے ناک چڑھائی۔ "امی جان، یہ جو کل آپ نے مارکٹ سے مالٹے لئے تھے، کیا وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"
لڑکیوں کی ماں بولی۔ "شفقت بٹیا یہ صحیح کہتی ہے۔ یہاں کے مالٹے وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"
عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا۔ "طلعت، یہ مچنگا کیا ہوتا ہے —— نام تو بڑا عجیب و غریب ہے۔"
طلعت مسکرائی۔ "آپا ایک پھل ہے۔ مالٹے اور میٹھے کی طرح —— اتنا لذیذ

ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی ـــــ اور رس ـــــ ایک نچوڑ دیجئے ـــــ یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے، لبالب بھر جائے۔"

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔ "ایک نچنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے؟"

طلعت نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "جی ہاں!"

شفقت نے یہ سن کر کہا۔ "تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگا۔"

طلعت نے سر ہلایا۔ "جی نہیں ـــــ بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا ـــــ بس آپ کے یہاں کے بڑے مالٹے کے برابر ہوتا ہے ـــــ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اُس میں ـــــ اور امّی جان وہاں کا اناناس ـــــ بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے۔"

دیر تک اناناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طلعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ مگر جس کا نام نگہت تھا بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ اُس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی رہی ہے تو وہ اُس سے مخاطب ہوا۔ "آپ کو غالباً ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

نگہت نے اپنے ہونٹ کھولے۔ "جی نہیں ـــــ سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے۔"

شفقت نے کہا۔ "لیکن آپ بولیں نہیں۔"

عزیز کی بیوی نے جواب دیا۔"شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔"
شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔"چچی جان ــــ اِس عمر میں لڑکیوں کو خاموشی پسند نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہو۔" پھر وہ نگہت سے مخاطب ہوا۔"جناب آپ کو بولنا پڑے گا۔"
نگہت کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔"بول تو رہی ہوں بھائی جان"
شفقت مسکرایا۔"تصویروں سے دلچسپی ہے آپ کو۔"
نگہت نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا۔"جی ہے۔"
"تو اُٹھئے میں آپ کو اپنا البم دکھاؤں ــــ دوسرے کمرے میں ہے۔" یہ کہہ کر شفقت اٹھا۔"چلئے۔"
عائشہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اُس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ طلعت کھٹ سے اُٹھی۔"چلئے بھائی جان ــــ مجھے دوسروں کے البم دیکھنے کا بہت شوق ہے ــــ میرے پاس بھی ایک کولکشن ہے۔"
شفقت، طلعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت، خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت، طلعت کو تصویریں دکھاتا رہا۔ حسبِ عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش

کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اُس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اُس نے اس کو چلنے کیلئے کہا تو عائشہ نے اُس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اُس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہوگئیں طلعت نے البم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔ "باجی کو دکھاتی ہوں۔ اُن کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا۔"

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اُس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت البم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے البم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول دکھائی دیتی تھی۔ شفقت کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھند میں لپٹا تھا۔ اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اُس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور چھت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے میں لرزی اور وہیں دب گئی۔

تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیارے انداز میں کہا۔ "بھائی جان شکریہ!"

شفقت نے البم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ اُس کے

دماغ میں کھُدبُد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا اسرار اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اُس نے سوچا شاید کوئی نامکمل رومان ہو، یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔

چائے آئی تو شفقت، نگہت سے مخاطب ہوا۔ "اُٹھئے، چائے بنایئے ——— یہ پروِلج لیڈیز کا ہے۔"

نگہت خاموش رہی لیکن طلعت پھُدک کر اٹھی۔ "بھائی جان میں بناتی ہوں۔"

نگہت کا چہرہ پھر دھند میں ملفوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اُس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ سٹ پٹا سی گئی۔ شفقت کو دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اُس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔

چائے پر اِدھر اُدھر کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ طلعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخریہ انداز میں جو شیخی کی حد تک جا پہنچا تھا، بتایا کہ وہ نیرؔوبی میں نمبر ون ٹینس پلیئر تھی اور پندرہ بیس کپ جیت چکی تھی ———

نگہت بالکل خاموش رہی۔ اُس کی خاموشی بڑی اداس تھی۔ صاف عیاں تھا۔ کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔

ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتا کا رُخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اُس نے خود اُٹھ کر بڑے پیار محبت سے اُس کو کریم رول دیئے۔ منہ پونچھنے کے لئے اپنا رومال دیا۔ اُس سے کوئی بات کرنی تھی تو

تو اس میں پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے سے بھی اُس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیر رہی ہے یا اس کو چمکار رہی ہے۔

رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی اُٹھی، برقع اٹھایا، عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت کو دعائیں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو لا دینے والے پیار سے کہا۔ "چلو بیٹا چلیں"۔

طلعت پھدک کر اُٹھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھاما، دوسرا بازو طلعت نے پکڑا۔ اس کو اٹھایا گیا —— شفقت نے دیکھا کہ اُس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان ہے —— ایک لحظے کے لئے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلا تو اُسے اپنے اندر ایک ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہوئی۔

لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر ماں اور بہن کا سہارا لئے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اُس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیارا انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسہ مارا —— سارا اسرار اُس پر واضح ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اُس کے دماغ میں یہ آیا۔ "قدرت کیوں اتنی بے رحم ہے —— ایسی پیاری لڑکی اور اُس کے ساتھ اس قدر ظالمانہ اور بہیمانہ سلوک —— اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟"

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے گئی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا، اتنے میں شفقت کے دوست آ گئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت

کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا —— اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا مشغول ہوا کہ نگہت اور اُس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اُسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوایا تو اُسے افسوس ہوا کہ اُسنے محض ایک کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا، چنانچہ اس کا ذکر اُس نے عائشہ سے بھی کیا، لیکن اُس نے کہا۔ "آپ کھانا کھایئے، مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی۔"

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے اُن کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے، اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے، مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو صرف اپریشن سے دور ہو سکتا ہے، مگر وہ اس سے بہت خائف تھی۔ میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گذار رہے تھے۔ اُن کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیٹتے حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت یاد آئی۔ اُس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "عائشہ، نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟"

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "تین برس کی ننھی منّی بچی تھی کہ تپ محرقہ ہوا۔ نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔"

شفقت کے دل میں نگہت کے لئے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔

اُس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا، "عائشہ، خدا کیوں اِتنا ظالم ہے؟"

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن کے واقعات یاد آنے لگے۔ جب میں نے اُس نے کہا تھا کہ چلو، میں تمہیں البم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لئے دبایا تھا کہ......"

"ہاں ہاں، اور کیا؟ ـــــ آپ تو بار بار ـــــ"

"خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپاہج ہے۔"

"تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیر مارا ہے۔"

"جب وہ آئی، تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا ـــــ بے چاری کو پیشاب کرنا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔ ازار بند کھولا ـــــ پھر بند کیا ـــــ کتنی خوبصورت ہے ـــــ بیٹھی ہو......"

"تو خدا کی قسم بالکل پتا نہیں چلتا کہ فالج زدہ ہے۔"

"بڑی ذہین لڑکی ہے۔"

"اچھا؟"

"ماں کہتی تھی کہ اُس نے کہا تھا کہ امّی جان میں شادی نہیں کروں گی، کنواری رہوں گی!"

شفقت تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اِس کے بعد اُس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تو اُس کو اِس بات کا احساس ہے کہ اُس سے شادی کرنے کے لئے کوئی رضامند نہیں ہو گا۔"

عائشہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک اپاہج سے؟"

"نہیں نہیں ایسا نہ کہو عائشہ!"

"اتنی بڑی قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"خوبصورت ہے، اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے ـــ سب ٹھیک ہے، مگر......"

"میں سمجھتا ہوں ـــ لیکن ـــ"

"مردوں کے دل میں رحم کہاں؟"

شفقت نے کروٹ بدلی۔ "ایسا نہ کہو، عائشہ"

عائشہ نے بھی کروٹ بدلی۔ دونو روبرو ہو گئے۔ "میں سب جانتی ہوں کوئی ایسا مرد ڈھونڈیئے جو اِس بیچاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔"

"مجھے معلوم نہیں، لیکن ـــ"

"بڑی بہن ہے، غریب کو کتنا بڑا دکھ ہے کہ اُس کی چھوٹی بہن کی شادی کی

بات چیت ہو رہی ہے۔"

"صحیح کہتی ہو تم!"

عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری۔ "کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے گی۔"

"نہیں!" یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔

عائشہ نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"تمہیں اُس سے ہمدردی ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"خدا کی قسم کھا کر کہو۔"

"ہائے، یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے، ہر انسان کو اُس سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔"

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "تو میں نے ایک بات سوچی ہے؟"

عائشہ نے خوش ہو کر کہا۔ "کیا؟"

"مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے کہ تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے —— میں نے —— خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے —— میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی

رحمتِ خداوندی کے پھول

'زمیندار' اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمتِ خداوندی کے پھول برستے تھے تو یار دوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، اس لئے کہ غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم۔بی۔بی۔ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا۔ مگر کہاں ڈاکٹر راتھر، کہاں غلام رسول۔

ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے سے قوتِ مردمی کی دوائیں بیچتا تھا۔ خدا اور اُس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرّب بتاتا تھا اور یوں سیکڑوں روپے کماتا تھا۔ غلام رسول کو ایسی دواؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، اور اس کو قوتِ مردمی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی، لیکن پھر بھی اُس کے یار دوست اُس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کا یا کلپ

کو اُس نے تسلیم کرلیا تھا۔ اس لیئے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اُس کے دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ موڈرن ہے۔

اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر ہی کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس لیئے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی اُس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ بننا چاہتا تھا۔ وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑا تھا۔ اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ کالج اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لیئے جانا پڑتا ہے۔

اُس کے والدین مصر تھے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرے۔ اُس کے والد کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی صباح الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہوگا، چنانچہ جب اُس کو ایل، ایل، بی پاس کرا کے لندن بھیجا گیا تو وہ بیرسٹر بن کر ہی آیا۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔

گو ڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم۔ بی، بی، ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا، مگر اس کے باپ کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا

اس قدر فرماں بردار تھا کہ اُس کو بھی یقین تھا کہ ایک روز وہ انڈن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہوگا اور اُس کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوگی۔

ڈاکٹر ڈاتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ سادہ لوح تھا۔ لیکن سب سے بڑی بُرائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ ملائے لیکن یار دوستوں نے اُس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اُن کو اس کا ٹھکانا معلوم ہو گیا۔ سیوائے بار، میں شام کو سات بجے پہنچ جاتے۔ مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو اُنہیں اپنے ساتھ پلانا پڑتی۔ یہ لوگ اُس کا گن گاتے، اُس کے مستقبل کے متعلق بڑی حوصلہ افزا باتیں کرتے۔ راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔

پانچ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اُس کو اپنے باپ سے دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ رہتا الگ تھا۔ مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا۔ دن اچھے تھے۔ ورنہ راتھر کی بیوی کو فاقے کھینچنے پڑتے، لیکن پھر بھی اُس کا ہاتھ تنگ ہو گیا اس لئے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔

ان دنوں شراب بہت سستی تھی۔ آٹھ روپے کی ایک بوتل۔ ادھا چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ مگر ہر روز ایک ادھا لینا، یہ ڈاکٹر راتھر کی بساط سے باہر تھا اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کی بیوی فوراً طلاق لے لیتی۔ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اُس کو

شرابیوں سے سخت نفرت تھی، نفرت ہی نہیں، اُن سے بہت خوف آتا تھا۔ کسی کی سُرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی، ہائے، ڈاکٹر صاحب، کتنی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس آدمی کی ——— ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے۔"

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا کہ اُس کی آنکھیں کیسی ہیں، کیا پی کر آنکھوں میں سرخ ڈورے آتے ہیں؟ ——— کیا اُس کی بیوی کو اُس کی آنکھیں ابھی تک سرخ نظر نہیں آئیں؟ ——— کب تک اُس کا راز راز رہے گا؟ ——— منہ سے بُو تو ضرور آتی ہو گی ——— کیا وجہ ہے کہ اُس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی۔ پھر وہ یہ سوچتا "نہیں" میں بہت احتیاط برتتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اُس سے بات کی ہے۔ ایک دفعہ اُس نے پوچھا تھا کہ آپ کی آنکھیں آج سرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا، دھول پڑ گئی ہے۔ اسی طرح ایک بار اُس نے دریافت کیا تھا، یہ بُو کیسی ہے، تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا، آج سیگار پیا تھا ——— بہت بُو ہوتی ہے کم بخت میں۔"

ڈاکٹر راتھر اکیلا پینے کا عادی تھا۔ اُس کو ساتھی نہیں چاہیئے تھے۔ وہ کنجوس تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوستوں کو پلائے اُس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اُس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر راٹھر، پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا، لیکن اُس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دوائیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں۔ اور اُن پر اکثر یہ لکھا ہوتا ہے۔ "شیک دی بوٹل بی فور یوز"۔۔۔۔ اُس نے اتنے علم پر اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں۔ آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے یہ سوچا کہ وہ گھر ہی میں پیا کرے گا۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ وہ دوا کی بوتل میں شراب ڈلوا کر گھر رکھ دے گا۔ بیوی سے کہے گا کہ اُس کے سر میں درد ہے اور اس کے استاد ڈاکٹر سیّد رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے اور کہا ہے۔ کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے، انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔

یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر راٹھر بے حد خوش ہوا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اُس نے ایک نیا امریکا دریافت کر لیا ہے، چنانچہ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "نسیمہ، آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا۔

نسیمہ نے بڑے تردد سے کہا۔ "کالج نہ جائیے آج"۔

ڈاکٹر راٹھر مسکرایا۔ "پگلی، آج تو مجھے ضرور جانا چاہیئے۔۔۔۔ ڈاکٹر سیّد رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے"۔

"ہاں ہاں، ضرور جائیے۔۔۔۔ میرے متعلق بھی اُن سے بات کیجئے گا"۔

نسیمہ کو میلان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر راتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر اُس نے کہا۔ "ہاں ہاں بات کروں گا ___ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لئے کوئی نہایت ہی کڑوی اور بدبُودار دوا تجویز کر دیں گے۔"

"آپ خود ڈاکٹر ہیں، دوائیں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن بدبُودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے۔"

"آپ دیکھئے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں۔ ابھی سے کیوں ایسی رائے قائم کر رہے ہیں آپ؟"

"اچھا" کہہ کر ڈاکٹر راتھر اپنے سر کو دباتا کالج چلا گیا۔ شام کو وہ دوا کی بوتل میں وسکی ڈلوا کے لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ دیں گے۔ جو بے حد کڑوی اور بدبودار ہوگی ___ لو، ذرا اسے سونگھو۔" بوتل کا کارک اُتار کر اُس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی ناک کے ساتھ لگا دیا۔ اُس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا۔ "بہت واہیات سی بُو ہے۔"

"اب ایسی دوا کون پیئے؟"

"نہیں نہیں ___ آپ ضرور پئیں گے ___ سر کا درد کیسے دُور ہوگا؟"

"ہو جائے گا اپنے آپ"

"اپنے آپ کیسے دُور ہوگا ___ یہی تو آپ کی بُری عادت ہے۔ دوا لاتے

ہیں مگر استعمال نہیں کرتے:

"یہ بھی کوئی دوا ہے ـــــ ایسا لگتا ہے جیسے شراب ہے۔"

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگریزی دواؤں میں شراب ہوا کرتی ہے۔"

"لعنت ہے ایسی دواؤں پر!"

ڈاکٹر راتھر کی بیوی نے خوراک کے نشان دیکھے اور حیرت سے کہا۔ "اتنی بڑی خوراک!"

ڈاکٹر راتھر نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہی تو مصیبت ہے!"

"آپ مصیبت مصیبت نہ کہیں، اللہ کا نام لے کر پہلی خوراک پئیں ـــــ پانی کتنا ڈالنا ہے؟"

ڈاکٹر راتھر نے بوتل اپنی بیوی کے ہاتھ سے لی اور مصنوعی طور پر بادل ناخواستہ کہا۔ "سوڈا منگوانا پڑے گا ـــ عجیب و غریب دوا ہے ـــــ پانی نہیں سوڈا"

یہ سن کر نسیمہ نے کہا۔ "سوڈا اس لئے کہا ہوگا کہ آپ کا معدہ خراب ہے۔"

"خدا معلوم کیا خراب ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے ایک خوراک گلاس میں ڈالی۔ "بھئی خدا کی قسم میں نہیں پیوں گا۔"

بیوی نے بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہیں نہیں ـــــ پی جائیے ـــــ ناک بند کر لیجئے۔ ـــ میں اسی طرح فیوٹکیچر پیا کرتی ہوں۔"

ڈاکٹر راتھر نے بڑے نخروں کے ساتھ شام کا پہلا پگ پیا۔ بیوی نے اُس کو

شاباش دی اور کہا۔ "پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک۔ خدا کے فضل و کرم سے دردیوں چٹکیوں میں دور ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر راتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اُس کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ اُس نے دوا کے بجائے شراب پی ہے، لیکن جب ہلکا سا سرور اُس کے دماغ میں نمودار ہُوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنسا۔ ترکیب خوب تھی۔ اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک گلاس میں انڈیلی۔ اس میں سوڈا ڈالا اور ڈاکٹر راتھر کے پاس لے آئی۔ "یہ لیجئے دوسری خوراک —— کوئی ایسی بری بُو تو نہیں ہے۔"

ڈاکٹر راتھر نے گلاس پکڑ کر بڑی بددلی سے کہا، تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو۔ خدا کی قسم شراب کی سی بُو ہے —— ذرا سونگھ کر تو دیکھو!"

"آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں۔"

"نسیمہ، خدا کی قسم ضد نہیں کرتا —— ضد کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، لیکن —— خیر، ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے گلاس منہ سے لگایا اور شام کا دوسرا پگ غٹا غٹ چڑھا گیا۔

تین خوراکیں ختم ہو گئیں۔ ڈاکٹر راتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس کیا، لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا۔ ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا ہے کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہو گا، لیکن دوا کا استعمال برابر جاری رہنا چاہیئے

خدا معلوم کیا نام لیا تھا انہوں نے بیماری کا ـــــ کہا تھا معمولی سر کا درد ہوتا تو وہ خوراکوں ہی سے دُور ہو جاتا۔ مگر تمہارا کیس فدا سیریس ہے۔"

یہ سن کر نسیمہ نے تردد سے کہا۔" تو آپ کو دوا اب باقاعدہ پینی پڑے گی۔"

"میں نہیں جانتا ـــــ تم وقت پر دے دیا کرو گی تو قہرِ درویش بر جانِ درویش پی لیا کروں گا۔"

نسیمہ نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اس کو دی۔ اُس کی بُو ناک میں گھسی تو متلی آنے لگی مگر اس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔

ڈاکٹر راٹھر نے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر پیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اُس کا خاوند اُس کا کہا مان رہا ہے، کیونکہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے میں ڈاکٹر بہت بدنام تھا۔

کئی دن گذر گئے۔ خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر راٹھر بڑا مسرور تھا کہ اُس کی ترکیب سودمند ثابت ہوئی۔ اب اُسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہر شام گھر میں بسر ہوتی۔ ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اُس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی طرح تیسری خوراک اُس کو بن مانگے مل جاتی ـــــ ڈاکٹر راٹھر بے حد مطمئن تھا۔ اتنے دن گذر جاتے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے

یہ دوا کا سلسلہ ایک معمول ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر راتھر اب ایک پوری بوتل لے آیا تھا۔ اس کا لیبل وغیرہ اتار کر اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔ "کیمسٹ میرا دوست ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ آپ ہر روز تین خوراکیں لیتے ہیں، دوا آپ کو یوں مہنگی پڑتی ہے۔ پُوری بوتل لے جائیے۔ اس میں سے چھوٹی نشانوں والی بوتل میں ہر روز تین خوراکیں ڈال لیا کیجئے ـــــ بہت سستی پڑے گی اس طرح آپ کو یہ دوا۔"

یہ سن کر نسیمہ کو خوشی ہوئی کہ چلو بچت ہو گئی۔ ڈاکٹر راتھر بھی خوش تھا کہ اُس کے کچھ پیسے بچ گئے، کیونکہ روزانہ تین پگ لینے میں اُسے زیادہ دام دینے پڑتے تھے اور بوتل آٹھ روپوں میں مل جاتی تھی۔

کالج سے فارغ ہو کر ڈاکٹر راتھر ایک دن گھر آیا تو اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر راتھر نے اس سے کہا۔ "نسیمہ، کھانا نکالو، بہت بھوک لگی ہے۔"

نسیمہ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کھانا ـــــ کیا آپ کھانا کھا نہیں چکے؟"

"نہیں تو"

"نسیمہ نے ایک لمبی "نہیں" کہی۔ "آپ ـــــ کھانا کھا چکے ہیں ـــــ میں نے آپ کو دیا تھا۔"

ڈاکٹر راتھر نے حیرت سے کہا۔ "کب دیا تھا۔ میں ابھی ابھی کالج سے آ رہا ہوں"

نسیمہ نے ایک جمائی لی۔ "جھوٹ ہے ـــــ آپ کالج تو گئے ہی نہیں۔"

ڈاکٹر راٹھر نے سمجھا، نسیمہ مذاق کر رہی ہے، چنانچہ مسکرایا۔ "چلو اُٹھو، کھانا نکالو۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

نسیمہ نے ایک اور لمبی "نہیں" کہی۔ "آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

"کب؟ ــــ حد ہو گئی ہے ــــ چلو اُٹھو، مذاق نہ کرو۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر راٹھر نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا۔ "خدا کی قسم میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

نسیمہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "چوہے ــــ آپ یہ چوہے کیوں نہیں کھاتے؟"

ڈاکٹر راٹھر نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں"

نسیمہ نے سنجیدگی اختیار کر کے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے خاوند سے کہا۔ "ہیں ــــ میں ــــ سر میں درد تھا میرے ــــ آپ کی دوا کی دو خو ــــ خو ــــ خوراکیں پی ہیں ــــ چوہے ــــ چوہے بہت ستاتے ہیں ــــ ان کو مارنے والی گولیاں لے آیئے ــــ کھانا؟ ــــ نکالتی ہوں کھانا۔"

ڈاکٹر راٹھر نے اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا۔ "تم سو جاؤ، میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

نسیمہ زور سے ہنسی۔ "میں نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا۔"

ڈاکٹر راٹھر نے جب دوسرے کمرے میں جا کر مضطرب حالت میں زمیندار کا تازہ پرچہ کھولا تو اس کو ایک خبر کی سرخی نظر آئی۔ "ڈاکٹر راٹھر پر رحمتِ خداوندی

کے پھول"۔ اس کے نیچے یہ درج تھا کہ پولیس نے اُس کو دھوکا دہی کے سلسلے میں میں گرفتار کرلیا ہے۔

غلام رسول عرف ڈاکٹر راتھر نے یہ خبر پڑھ کر یوں محسوس کیا کہ اُس پر رحمتِ خداوندی کے پھول برس رہے ہیں۔

---

۲۵ جولائی ۱۹۵۰ء

ساڑھے تین آنے

"میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب و عواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا ـــــ مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جُرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل ہے ـــــ چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لئے میری رائے نادرست نہیں ہو سکتی۔ مجھے منٹو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے ـــــ اور یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہوئے بھی ہزارہا جیل خانے موجود ہیں۔

ہتھکڑیاں ہیں اور وہ ننگِ انسانیت بیڑیاں ―― میں قانون کا یہ زیور پہن چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اُس کے موٹے موٹے حبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے۔ جب اس نے یکایک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کوفی پی رہا تھا۔ جب اُس نے خود کو متعارف کیا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آ گئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اُس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے سے بچا لی تھی۔

وہ اُسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شائستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "معاف کیجئے گا منٹو صاحب ―― آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں ادیب تو نہیں، لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اُس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔" پھر اس نے کہا۔ "میرا نام صدیق رضوی ہے ―― لنڈا بازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اُس سے متعلق تھا۔"

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا۔ لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سرخیاں اُبھر آئیں۔

ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا: "یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے۔" تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے

کریم ملی ہوئی کوفی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ منٹو صاحب آدمی جرم کیوں کرتا ہے —— جرم کیا ہے، سزا کیا ہے —— میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے —— زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ہوتا ہے، بہت الجھا ہوا، ٹیڑھا میڑھا —— میں نفسیات کا ماہر نہیں —— لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے!!

نصیر نے کہا۔ "آپ نے بالکل درست کہا ہے۔"

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا: "مجھے معلوم نہیں جناب، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو —— فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا —— شاید کسی اور ملک کا ہو —— آپ تو خیر جانتے ہی

ہوں گے، جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے ـــ مجھے اُس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو صاحب، غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا ـــ کیا تھا؟ ـــ وہ سیڑھی اُتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے ـــ لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیڑھی کون سی ہے۔ اُس کے کتنے زینے ہیں،

کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے ـــ منٹو صاحب، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد شماری کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں ـــ اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں ـــ کیا یہ اُن کا فرض نہیں ـــ میں نے قتل کیا ـــ لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کرکے کیا ـــ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لئے کہ قتل کا ثبوت اُس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں ـــ وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب میرے نزدیک نہیں ہیں، اُن میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں؟"

ساڑھے تین آنے

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اُس کی گفتگو سے ثابت ہُوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اُس سے کچھ کہا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لئے میں اُس کی گفتگو میں حائل نہ ہُوا۔

اُس کے لئے نئی کوفی آ گئی تھی۔ اسے بنا کر اُس نے چند گھونٹ پئے اور کہنا شروع کیا۔ "خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے ــــــ اس آدمی کا، اُس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اُس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔"

نصیر نے حیرت سے پوچھا۔ "صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟"

رضوی نے تلخ آلود جواب دیا۔ "جی ہاں ــــ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر ــــ اور جو اُس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا ــــ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور پھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کا پیٹ پھر اُسے مجبور کرے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اُس سے گُو مُوت صاف کرانے والے اُس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کو تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے ــــ یہ ہو سکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھئے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے ــــ

رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اُس سے کہا۔

"آپ پھگو بھنگی کی بات کر رہے تھے؟"

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کوفی رومال کے ساتھ پونچھی۔ جی ہاں ــــ پھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود، یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا۔ لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار ــــ خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چُرائے تھے، اُس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا ــــ میں دو دن کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اُس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے ــــ دو مہینوں کی تنخواہ ــــ حضور اُس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہوئے تھے ــــ حضور، میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لئے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا اس لئے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا ــــ حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں ــــ کچھ حالات ہی ایسے تھے

کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں ——— اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا ——— مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے ——— حضور، اب میرا بچہ بھی نہیں ہے، بیوی بھی نہیں ہے ——— لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور، مجھے معاف کر دو ——— لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید بامشقت کی سزا دے دی۔"

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اُس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگرٹ پہ سگرٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ پھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے؟"

"جی ہاں" رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ "میں نہیں جانتا۔ قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا ——— اور میرے نزدیک پھگو بھنگی نے بھی بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے ——— یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمانداری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں، اور سچ پوچھئے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لئے اچھی

ہو سکتی ہے، میرے لئے بُری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بُری ——— ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا اُن کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لئے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو ——— اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم ازکم خدا تو ہو۔"

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خامکاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔

اُس کی بیڑی بجھ گئی تھی، غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی، اس لئے کہ اُس نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو پھینک دی، اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "منٹو صاحب، بھگو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا ——— آپ کو بتاؤں گا" دِر کہیں گے کہ جذباتیت ہے، لیکن خدا کی قسم جذباتیت کو اس میں کو دخل نہیں ——— وہ میرا دوست نہیں تھا ——— نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔"

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے

اُسے سگرٹ پیش کیا تو اُس نے قبول کر لیا۔ "شکریہ ــــ منٹو صاحب، معاف کیجیے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیئے تھی اس لئے کہ ماشاءاللہ آپ ــــ"

میں نے اس کی بات کاٹی۔ "رضوی صاحب، میں اس وقت منٹو نہیں ہوں صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔ میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔"

رضوی مسکرایا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "آپ کی بڑی نوازش ہے۔" پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا۔ "میں کیا کہہ رہا تھا۔"

میں نے اُس سے کہا۔ "آپ بھگو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

"جی ہاں" یہ کہہ کر اُس نے میرا پیش کیا ہوا سگرٹ سلگایا۔ "منٹو صاحب، قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لئے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چرائے تھے۔ بڑی مشکلوں سے، دیوار پھاند کر جب اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا، مگر جب میرا ہم الزام دوست جرجی بیس بیڑیاں اسکی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف، گواہوں پہ بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے، لیکن جرجی نے بھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اُس کی فطرت بہت خوشبودار تھی۔ شروع شروع

میں جب وہ جرجی کی بیڑیاں لے کر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے فوراً ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی، مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا — بیڑی کے لئے اُس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوالی تھی مگر یہاں جیل میں جہاں اُس کو تمبا کو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام وکمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں — پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابوجی، ایک بیڑی تو دیجئے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا — انسان بھی کتنا کمینہ ہے!"

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے۔ "جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لئے روپے بھی مل جاتے تھے — پھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اُس نے آخری بار جرجی کی دی ہوئی بیس بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اُس نے کہا، "بابوجی، میں پھر یہاں آجاؤں گا — بھوکے انسان کو چوری

کرنی ہی پڑتی ہے ـــــ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے ـــــ بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے ـــــ خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔"

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔ "اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔"

رضوی نے گرم کوفی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ "جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ـــــ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں ـــــ خدا معلوم اُن سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی!" رضوی نے کوفی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہاں منٹو صاحب، اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی ـــــ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پھگو کے ذریعہ سے اُس تک بھجوایا تھا۔ کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔ پھگو اَن پڑھ تھا۔ شام کو وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اُس نے مجھے دیا۔ اُس میں دس روپے کا سُرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ رضوی پیارے دس روپے بھیج تو رہا ہوں، مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خدا کرے تمہیں مل جائیں

کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔" میں نے یہ تحریر پڑھی تو بھگو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کو ساڑھے تین آنے چُرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اُس کو کیا سزا ملتی؟"

یہ کہہ کر رضوی نے کوفی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کوفی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

۲۶ر جولائی ۱۹۵۰ء

پیرن

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں بے حد مفلس تھا۔ بمبئی میں نو روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا جس میں پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے ہزار ہا کھٹمل میرے اُوپر گرا کرتے تھے۔ چوہوں کی بھی کافی بہتات تھی ـــــ اِتنے بڑے چوہے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ بلّیاں ان سے ڈرتی تھیں۔

چالی یعنی بلڈنگ میں صرف ایک غسل خانہ تھا۔ جس کے دروازے کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ صبح سویرے چالی کی عورتیں پانی بھرنے کے لئے اس غسل خانے میں جمع ہو جاتی تھیں۔ یہودی، مرہٹی، گجراتی، کرسچین ـــــ بھانت بھانت کی عورتیں میرا یہ معمول تھا کہ ان عورتوں کے اجتماع سے بہت پہلے غسل خانے میں جاتا

دروازہ بھیڑتا اور نہانا شروع کر دیتا۔ ایک روز میں دیر سے اُٹھا۔ غسل خانے میں پہنچ کر نہانا شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد کھٹ سے دروازہ کھُلا، میری پڑوسن تھی۔ بغل میں گاگر دبائے اُس نے معلوم نہیں کیوں ایک لحظے کے لئے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم پلٹی۔ گاگر اس کی بغل سے پھسلی اور فرش پر لڑھکنے لگی۔ ——— ایسی بھاگی جیسے کوئی شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں بہت ہنسا، اُٹھ کر دروازہ بند کیا اور نہانا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازہ کھُلا۔ برج موہن تھا۔ میں نہا کے فارغ ہو چکا تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ "بھئی منٹو آج اتوار ہے۔"

مجھے یاد آگیا کہ برج موہن کو باندرہ جانا تھا، اپنی دوست پیرن سے ملنے کے لئے۔ وہ ہر اتوار کو اُس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی پارسی لڑکی تھی جس سے برج موہن کا معاشقہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔

ہر اتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لئے لیتا۔ پیرن کے گھر پہنچتا۔ دونو آدھے گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے۔ برج موہن السٹریٹڈ ویکلی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا دن سر نیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لئے حل کرتا رہتا تھا۔ اُس کو چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے مگر وہ سب پیرن نے وصول کئے تھے۔ برج موہن نے ان میں سے ایک دمڑی بھی اُس سے نہ مانگی۔

برج موہن کے پاس پیرزن کی بے شمار تصـ ـ ہتیں شلوار قمیص میں چست پیجامے میں ساڑھی میں، فراک میں بیدنگ کسٹیوم میں، فیـ ـیں میں ـــــ غالباً سو سے اوپر ہونگی پیرزن قطعاً خوبصورت نہیں تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت ہی ادنیٰ شکل وصورت کی تھی لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرزن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ کیا وہ اُس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ ـــــ برج موہن نے بھی اُس کے بارے میں مجھ سے کبھی بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہر اتوار کو وہ ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لئے باندرہ روانہ ہو جاتا اور دوپہر تک لوٹ آتا۔

میں نے کھولی میں جاکر اس کو آٹھ آنے دیئے، وہ چلا گیا۔ دوپہر کو لوٹا تو اُس نے خلافِ معمول مجھ سے کہا۔ آج معاملہ ختم ہو گیا۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "کونسا معاملہ؟" مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔

برجموہن نے جیسے اُس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے "مجھ سے کہا۔ پیرزن سے آج دو ٹوک فیصلہ ہو گیا ہے ـــ میں نے اُس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اُس نے کہا بہتر ہے، ملنا چھوڑ دو۔ دیکھوں گی

تمہیں کیسے کام ... میں منحوس ہوں نہ تم ..... درجے کے نکھٹو اور کام چور ہو — سو اب یہ قصہ ختم ہوگیا ہے اور میرا خیال ہے انشاءاللہ کل ہی مجھے کام مل جائیگا صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا، وہ مجھے ضرور اپنا اسسٹنٹ رکھ لے گا۔"

یہ سیٹھ نانو بھائی جو فلم ڈائرکٹر تھا متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کرچکا تھا۔ کیونکہ اُس کا بھی ہیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکما ہے لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو دوپہر کو اُس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ نانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اُسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے جس پر دستخط ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے "یہ ایڈوانس ہے — جی تو میرا چاہتا ہے کہ کنٹریکٹ اور سو روپے لیکر باندرہ جاؤں اور ہیرن سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے، لیکن ڈر ہے کہ نانو بھائی مجھے فوراً جواب دے دے گا — میرے ساتھ ایک نہیں دس مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، اُدھر ہیرن سے ملاقات ہوئی — معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آگئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اُس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ ایک برس لگا کر کچھ بنوا لوں تو پھر دیکھا جائے گا۔"

چھ مہینے گذر گئے۔ برج موہن برابر کام پر جا رہا تھا۔ اُس نے کئی نئے کپڑے بنوا لئے تھے۔ ایک درجن رومال بھی خرید لئے تھے۔ اب وہ تمام چیزیں اُس کے پاس تھیں جو ایک کنوارے آدمی کے آرام و آسائش کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ اسٹڈیو گیا ہوا تھا کہ اُس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اُسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اُس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ پکڑتے ہی وہ زور سے چیخا۔ "لعنت!"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہی پیرن —— اچھی بھلی زندگی گذر رہی تھی۔" یہ کہہ کر اُس نے چمچ سے لفافہ کھولا خط کا کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا۔ "وہی کم بخت ہے —— میں کبھی اُس کا ہینڈ رائٹنگ بھول سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا لکھتی ہے؟"

"میرا سر —— کہتی ہے مجھ سے اس اتوار کو ضرور ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔" یہ کہہ کر برج موہن نے خط لفافے میں ڈالا اور جیب میں رکھ لیا۔ "لو بھئی منٹو، نوکری سے انشاء اللہ کل ہی جواب مل جائے گا۔"

"کدا ... کہتے ہوئے"

نے بڑے وثوق سے کہا۔ "نہیں منٹو تم دیکھ لینا۔ کل اتوار ہے۔

ور مجھ سے کوئی نہ کوئی شکایت ... ور وہ مجھے فوراً نکال

باہر کرے گا۔"

میں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہیں اتنا وثوق ہے تو مت جاؤ اُس سے ملنے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ـــ وہ بلائے تو مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔"

"کیوں؟"

"ملازمت کرتے کرتے کچھ میں بھی اکتا چکا ہوں ـــ چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

دوسرے روز ناشتہ کر کے وہ باندرہ چلا گیا۔ بیرن سے ملاقات کر کے لوٹا۔ تو اُس نے اس ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "مل آئے اپنے منحوس ستارے سے؟"

"ہاں بھئی ـــ اُس سے کہہ دیا کہ ملازمت سے بہت جلد جواب مل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ کھاٹ پر سے اُٹھا۔ "چلو آؤ کھانا کھا آئیں۔"

ہم دونوں نے حاجی کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران میں بیرن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے اُس نے صرف اتنا کہا۔ "اب دیکھئے کل کیا گل کھلتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ مگر دوسرے روز برجمہ خلافِ معمول اسٹوڈیو سے جلد لوٹ آیا۔ مجھ سے ملا تو خوب زور سے ہنسا۔

میں نے سمجھا مذاق کر رہا ہے۔ "ہٹاؤ جی"

"جو ہٹنا تھا وہ تو ہٹ گیا ــــ اب میں کیسے ہٹاؤں ــــ سیٹھ نانو بھائی پر تانج آ گئی ہے ــــ اسٹڈیو سیل ہو گیا ہے۔ میری وجہ سے خواہ مخواہ بیچارے نانو بھائی پر بھی آفت آئی۔" یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ "یہ عجیب سلسلہ ہے!"

"دیکھ لو ــــ اسے کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" برج موہن نے سگرٹ سلگایا اور کیمرہ اٹھا کر باہر گھومنے چلا گیا۔

برج موہن اب بیکار تھا۔ جب اُس کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو اُس نے ہر اتوار کو پھر مجھ سے باندرہ جانے کے لئے آٹھ آنے مانگنے شروع کر دئے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں آدھ پون گھنٹے میں وہ پیرن سے کیا باتیں کرتا تھا۔ ویسے وہ بہت اچھی گفتگو کرنے والا تھا۔ مگر اُس لڑکی سے جس کی نحوست کا اُس کو مکمل طور پر یقین تھا وہ کس قسم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے ایک روز اُس سے پوچھا۔ "برج، کیا پیرن کو بھی تم سے محبت ہے؟"

"نہیں، وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔"

"تم سے کیوں ملتی ہے؟"

"اس لئے کہ میں ذہین ہوں، اُس کے بھدّے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اُس کو انعام بھی دلوا دیتا ہوں ــــ منٹو، تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب

پہچانتا ہوں انہیں — جس سے وہ محبت کرتی ہے، اُس میں جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "بڑی چار سو بیس ہے!"

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "مگر تم کیوں اُس سے ملتے ہو؟"

برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اُس نے کہا۔ "مجھے مزا آتا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"اُس کی نحوست کا — میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اُس کی نحوست کا امتحان — یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اُتری ہے۔ میں نے جب بھی اُس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا — اب میری ایک خواہش ہے کہ اُس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود اپنے آقا کو جواب دے دوں۔ اُس سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے، یہ میری دوست پیرن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھستی ہے جیسے تیر!"

برج موہن مسکرایا۔ "یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "عجیب و غریب خواہش ہے۔"

"میری ہر چیز عجیب و غریب ہوتی ہے ——" پچھلے اتوار میں نے پیرن کے اُس دوست کے لئے جس سے وہ محبت کرتی ہے، ایک فوٹو تیار کر کے دیا۔ اُلّو کی دم آسے کمپٹیشن میں بھیجے گا —— یقینی طور پر انعام ملے گا اُسے۔" یہ کہہ کر وہ مُسکرایا۔

برج موہن واقعی عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ پیرن کے دوست کو کئی بار فوٹو تیار کر کے دے چکا ہے۔ السٹریٹیڈ ویکلی میں یہ فوٹو اُس کے نام سے چھپتے تھے اور پیرن بہت خوش ہوتی تھی۔ برج موہن ان کو دیکھتا تھا تو مسکرا دیتا تھا۔ وہ پیرن کے دوست کی شکل صورت سے ناآشنا تھا، پیرن نے برج موہن سے اُس کی ملاقات تک نہ کرائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی مل میں کام کرتا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔

ایک اتوار کو برج باندرہ سے واپس آیا تو اُس نے مجھ سے کہا۔ "لو بھئی منٹو، آج معاملہ ختم ہو گیا۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "پیرن والا؟"

"ہاں بھئی —— کپڑے ختم ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کرو —— اب انشاء اللہ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی —— میرا خیال ہے

سیٹھ نیاز علی سے ملوں ـــــ اُس نے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے ـــــ کل ہی جاؤں گا۔ تم یار ذرا اُس کے دفتر کا پتا لگا لینا۔

میں نے اُس کے دفتر کا نیا فون ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔ وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا۔ اُس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "لو بھئی منٹو" یہ کہہ کر اُس نے جیب سے ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ "ایک پکچر کا کنٹریکٹ۔ تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ کم ہے، لیکن سیٹھ نیاز علی نے کہا ہے، بڑھا دوں گا ـــــ ٹھیک ہے!"

میں ہنسا۔ "اب پیرن سے کب ملو گے؟"

برج موہن مسکرایا۔ "کب ملوں گا؟ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کہ مجھے اُس سے کب ملنا چاہیئے ـــــ منٹو یار، میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک میری چھوٹی سی خواہش ہے، بس وہ پوری ہو جائے ـــــ میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ ذرا میرے تین چار جوڑے بن جائیں۔ پچاس روپے ایڈوانس لے آیا ہوں۔ پچیس تم رکھ لو۔"

پچیس میں نے لئے۔ ہوٹل والے کا قرض تھا جو فوراً چکا دیا گیا۔ ہمارے دن بڑی خوشحالی میں گذرنے لگے۔ سو روپیہ ماہوار میں کما لیتا تھا۔ دو سو روپے ماہانہ برج موہن لے آتا تھا۔ بڑے عیش تھے۔ پانچ مہینے گذر گئے کہ اچانک ایک روز پیرن کا خط برج موہن کو وصول ہوا۔ "لو بھئی منٹو، عزرائیل صاحب تشریف لے آئے۔"

صحیح بات ہے کہ میں نے اُس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا مگر برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔

میں نے برج سے پوچھا۔ "کیا فرماتی ہیں؟"

"فرماتی ہیں، اتوار کو مجھ سے ضرور ملو۔ ایک اشد ضروری کام ہے۔" برج موہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ "جاؤ گے؟"

"جانا ہی پڑے گا ——" پھر اُس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

"مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا!"

میں نے اُس سے کہا۔ "برج مت جاؤ اُس سے ملنے —— بڑے اچھے دن گذر رہے ہیں ہمارے —— تم نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔"

برج موہن مسکرایا۔ "مجھے سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ اب وہ دن پھر آنے والے ہیں۔ جب تم خدا معلوم کس طرح مجھے ہر اتوار آٹھ آنے دیا کرو گے!"

اتوار کو برج، پیرن سے ملنے باندرہ گیا۔ واپس آیا تو اُس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ "میں نے اُس سے کہا، یہ بارھویں مرتبہ ہے کہ مجھے تمہاری نحوست کی وجہ سے برطرف ہونا پڑے گا —— تم پر رحمت ہو زرتشت کی!"

میں نے پوچھا۔ "اُس نے یہ سن کر کچھ کہا۔"

برج نے جواب دیا "فقط یہ —— تم سِلی ایڈیٹ ہو!"

"تم ہو؟"

"سو فی صدی!" یہ کہہ کر برج ہنسا۔ "اب میں کل صبح دفتر جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دینے والا ہوں۔ میں نے وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا تھا۔"

برج موہن نے مجھے استعفیٰ کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلافِ معمول اُس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو لوٹا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے ہی بالآخر اُس سے پوچھنا پڑا۔ "کیوں برج، کیا ہوا؟"

اُس نے بڑی ناامیدی سے سر ہلایا۔ "کچھ نہیں یار —— سارا قصّہ ہی ختم ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استعفےٰ پیش کیا تو اُس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں یہ لکھا تھا۔ کہ میری تنخواہ پچھلے مہینے سے دو سو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے!"

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اُس نے مجھ سے ایک روز کہا

"پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئی ——— اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کون مجھے بیکار رکھنے کا موجب ہو گا!"

۲۷ر جولائی ۱۹۵۰ء

خورشٹ

ہم دلّی میں تھے۔ میرا بچہ بیمار تھا۔ میں نے پڑوس کے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا
وہ ایک کبڑا آدمی تھا۔ بہت پست قد لیکن بے حد شریف۔ اُس نے میرے بچے
کا بڑے اچھے طریقے پر علاج کیا۔ اُس کو فیس دی تو اُس نے قبول نہ کی۔ یوں تو
وہ پارسی تھا لیکن بڑی شستہ و رفتہ اردو بولتا تھا، اس لئے کہ وہ دلّی ہی
میں پیدا ہوا تھا اور تعلیم اس نے وہیں حاصل کی تھی۔

ہمارے سامنے کے فلیٹ میں مسٹر کھیش والا رہتا تھا۔ یہ بھی پارسی تھا۔
اسی کے ذریعے سے ہم نے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا تھا۔ تین چار مرتبہ ہمارے یہاں
آیا تو اُس سے ہمارے تعلقات بڑھ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاں میرا اور میری بیوی کا
آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ہماری ملاقات اپنے لڑکے سے کرائی

اُس کا نام ساوک کاپڑیا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار آدمی تھا۔ رنگ بے حد زرد ایسا لگتا تھا کہ اُس میں خون ہے ہی نہیں۔ سنگر مشین کمپنی میں ملازم تھا۔ غالباً پانچ چھ سو روپئے ماہوار پاتا تھا۔ بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ اُس کا گھر جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مجال ہے کہ گرد و غبار کا ایک ذرّہ بھی کہیں نظر آجائے۔

جب میں اور میری بیوی شام کو اُن کے ہاں جاتے تو وہ اور اُس کی بیوی خورشید جس کو پارسیوں کی زبان میں خورشٹ کہا جاتا تھا، بڑے تپاک سے پیش آتے اور ہماری خوب خاطر تواضع کرتے۔

خورشید یعنی خورشٹ لمبے قد کی عورت تھی۔ عام پارسیوں کی طرح اُس کی ناک بدنما نہیں تھی، لیکن خوبصورت بھی نہیں تھی۔ موٹی پکوڑا ایسی ناک تھی، لیکن رنگ سفید تھا اس لئے گوارا ہو گئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول تھا خوش پوش تھی اس لئے اچھی لگتی تھی۔ میری بیوی سے چند ملاقاتوں ہی میں دوستی ہو گئی۔ چنانچہ ہم اُن کے ہاں اکثر جانے لگے۔ وہ دونو میاں بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آجاتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

ہم جب بھی ساوک کے ہاں گئے، ایک سکھ کو اُن کے ہاں دیکھا۔ یہ سکھ ایک تنومند آدمی تھا۔ بہت خوش خلق۔ ساوک نے مجھے بتایا کہ سردار زورآور سنگھ اس کا بچپن کا دوست ہے۔ دونو اکھٹے پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ انہوں نے بی۔ اے

پاس کیا۔ لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے سردار زور آور سنگھ، ساوک کے مقابلے میں زیادہ معمر نظر آتا تھا۔ ساوک شاید خون کی کمی کے باعث بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں لیکن سردار زور آور سنگھ چالیس کے اُوپر معلوم ہوتا تھا۔

سردار زور آور سنگھ، کنوارا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اُس نے گورمنٹ سے کئی ٹھیکے لے رکھے تھے۔ اُس کا باپ بہت پرانا گورمنٹ کنٹریکٹر تھا۔ لیکن باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی۔ سردار زور آور سنگھ آزاد خیال تھا۔ لیکن وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا، پر وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ البتہ اُس کی ماں اُس سے بہت پیار کرتی تھی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔ تین لڑکیاں تھیں، وہ اپنے گھر میں آباد ہو چکی تھیں۔ اب اُس کی خواہش تھی کہ وہ شادی کرلے اور اُس کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے، مگر وہ اِس کے متعلق بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

میں نے ایک دفعہ اس سے دریافت کیا۔ "سردار صاحب آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے مونچھوں کے اندر ہنس کر جواب دیا۔ "کروں گا، اتنی جلدی کیا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "آپ کی عمر کیا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال کے مطابق آپ کی عمر غالباً چالیس برس ہوگی۔"

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ "آپ کا اندازہ غلط ہے!"

"آپ فرمائیے، آپ کی کیا عمر ہے؟"

سردار زور آور سنگھ پھر مسکرایا۔ "میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں ——— عمر کے لحاظ سے بھی ——— میں ابھی پرسوں انتیس اگست کو پچیس برس کا ہوا ہوں۔"

میں نے اپنے غلط اندازے کی معافی چاہی۔ "لیکن آپ کی شکل صورت سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی عمر پچیس برس ہے۔"

سردار زور آور سنگھ ہنسا: "میں سکھ ہوں ——— اور بڑا غیر معمولی سکھ"۔ یہ کہہ کر اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "منٹو صاحب آپ حجامت کیوں نہیں کراتے۔ اتنے بڑے بالوں سے آپ کو وحشت نہیں ہوتی۔"

میں نے گردن پر ہاتھ پھیرا۔ بال واقعی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ غالباً تین مہینے ہو گئے تھے جب میں نے بال کٹوائے تھے۔ سردار زور آور سنگھ نے بات کی تو مجھے سر پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ "یاد ہی نہیں رہا۔ اب آپ نے کہا ہے تو مجھے وحشت محسوس ہوئی ہے۔ خدا معلوم مجھے کیوں بال کٹوانے یاد نہیں رہتے ——— یہ سلسلہ ہے ہی کچھ واہیات۔ ایک گھنٹہ نائی کے سامنے سر نیوڑھائے بیٹھے رہو۔ وہ اپنی خرافات بکتا رہے اور آپ مجبوراً کان سمیٹے سنتے رہیں ——— فلاں ایکٹرس ایسی ہے، فلاں ایکٹرس ویسی ہے۔ امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے۔ روس کے پاس اس کا بہت ہی تگڑا جواب موجود

ہے۔ یہ اٹلی کون ہے؟ —— اور وہ مسولینی کہاں گیا —— اب میں اگر اس سے کہوں کہ جہنم میں گیا ہے تو وہ ضرور پوچھتا کہ صاحب کیسے گیا، کس راستے سے گیا۔ کون سے جہنم میں گیا۔"

میری اتنی لمبی چوڑی بات سن کر سردار زور آور سنگھ نے اپنی سفید پگڑی اتاری —— مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ اُس کے کیس ندارد تھے۔ ان کے بجائے ہلکے خشخشی بال تھے۔ لیکن وہ پگڑی کچھ اس انداز سے باندھتا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیس ہیں اور ثابت و سالم ہیں۔

بڑی صفائی سے پگڑی اتار کر اُس نے میری تپائی پر رکھی اور مسکرا کر کہا: "میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے اُس کے بالوں کے متعلق کوئی بات نہ کی، اس لئے کہ میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اُس نے بھی ان کے متعلق کوئی بات نہ چھیڑی۔ پگڑی تپائی پر رکھ دینے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا تھا: "میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد اُس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اور کہا: "منٹو صاحب، خورشید کے لئے آپ کچھ کیجئے؟"

میں کچھ نہ سمجھا: "کون خورشید؟"

سردار زور آور سنگھ نے پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی "خورشید کاپڑیا کے لئے۔"

"میں اُن کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"اُس کو گانے کا بہت شوق ہے۔"

مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ خورشٹ گاتی ہے۔ "کیسا گاتی ہیں؟"

سردار زور آور سنگھ نے خورشٹ کی گائکی کے بارے میں اتنی تعریف کی کہ مجھے یہ سب مبالغہ معلوم ہوا۔ "منٹو صاحب بہت اچھی آواز پائی ہے۔ خصوصاً ٹھمری ایسی اچھی گاتی ہے کہ آپ وجد میں آجائیں گے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ خان صاحب عبدالکریم کو سن رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ خورشید نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ بس جو ملا ہے قدرت سے ملا ہے۔ آپ آج شام کو آیئے۔ مسز منٹو بھی ضرور تشریف لائیں۔ میں خورشید کو بلاؤں گا۔ آپ ذرا اسے سنئے گا۔"

میں نے کہا۔ "ضرور ضرور — مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاتی ہیں۔"

سردار زور آور سنگھ نے سفارش کے طور پہ کہا۔ "آپ ریڈیو اسٹیشن میں ہیں میں چاہتا ہوں کہ خورشید کو ہر مہینے کچھ پروگرام مل جایا کریں۔ روپئے کی اُس کو کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"لیکن اگر ان کو پروگرام ملے گا تو معاوضہ بھی ضرور ملے گا۔ گورمنٹ اُن کا معاوضہ کس کھاتے میں ڈالے گی؟"

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ "تو ٹھیک ہے۔ لیکن اُسے پروگرام ضرور دلوایئے گا — مجھے یقین ہے کہ سننے والے اُسے بہت پسند کریں گے۔"

اس گفتگو کے بعد ہم تیسرے روز ساوک کے ہاں گئے۔ وہ موجود نہیں تھا لیکن ڈرائنگ روم میں سردار زورآور سنگھ بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ پارسیوں میں سگرٹ پینا منع ہے، سکھ بھی سگرٹ نہیں پیتے، لیکن وہ بڑے اطمینان اور ٹھاٹ سے کش پہ کش لے رہا تھا۔ میں اور میری بیوی کمرے میں داخل ہوئے تو اُس نے سگرٹ پینا بند کر دیا۔ ایش ٹرے میں اُس کی گردن مروڑ کر اُس نے ہمیں خالص اسلامی انداز میں سلام کیا اور کہا۔ "خورشید کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔"

خورشید کچھ دیر کے بعد آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت قطعاً ناساز نہیں ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ تو اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔ "ذرا زکام تھا۔"

مگر اُس کو زکام نہیں تھا۔ سردار زورآور سنگھ نے بڑے زوردار انداز میں خورشید سے اُس کا حال پوچھا، زکام کے لئے کم از کم دس دوائیں تجویز کیں، پانچ ڈاکٹروں کے حوالے دیئے، مگر وہ خاموش رہی، جیسے وہ اس قسم کی بکواس سننے کی عادی ہے۔ اتنے میں خورشید کا خاوند ساوک کا پڑیا آ گیا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اُسے دیر ہو گئی تھی۔ مجھ سے اور میری بیوی سے اُس نے معذرت چاہی، سردار زورآور سنگھ سے کچھ دیر مذاق کیا اور ہم سے چند منٹ کی رخصت لے کر اندر چلا گیا، اس لئے کہ اُسے اپنی بچی کو دیکھنا تھا۔

اُس کی پلوٹھی کی بچی بہت پیاری تھی۔ میاں بیوی کی بس یہی ایک اولاد تھی۔

قریباً ڈیڑھ برس کی تھی۔ رنگ باپ کی طرح زرد —— کچھ نقش ماں پر تھے۔ باقی معلوم نہیں کس کے تھے۔ بہت ہنس مکھ تھی۔ ساوک اس کو گود میں اٹھا کر لایا۔ اور ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کو اپنی بچی سے بے حد پیار تھا۔ دفتر سے واپس آکر وہ سارا وقت اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ میرا خیال ہے قریب قریب ہر ہفتے وہ اس کے لئے کھلونے لاتا تھا۔ شیشوں والی بڑی الماری تھی — جو اِن کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔

سردار زور اور سنگھ کے متعلق بات چھڑی تو ساوک نے اُس کی بہت تعریف کی۔ اُس نے مجھ سے اور میری بیوی سے کہا۔ "سردار زور اور میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم دونو لنگوٹیے ہیں۔ اس کے والد صاحب اور میرے والد صاحب اسی طرح لنگوٹیے تھے۔ دونو اکھٹے پڑھا کرتے تھے۔ پہلی جماعت سے لیکر اب تک ہم دونو ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسکول ہی میں پڑھ رہے ہیں۔"

سردار زور اور سنگھ مسکراتا رہا۔ اُس کے سر پر سکھوں کی بہت بڑی پگڑی تھی، مگر مجھے اس کے ہوتے ہوئے اس کے سر کے خشخشی بال نظر آرہے تھے۔ اور مجھے اپنے سر پر اپنے بالوں کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

سردار زور آور سنگھ کے پیہم اصرار پر خورشید نے باجا منگا کر ہمیں گانا سنایا۔ وہ کن سُری تھی، لیکن خورشید، اُس کے خاوند، اور سردار زور اور سنگھ کی خاطر

مجھے اُس کے گانے کی مجبوراً تعریف کرنا پڑی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "ماشاءاللہ آپ خوب گاتی ہیں۔"

سردار زور اور سنگھ نے بڑے زور سے تالی بجائی اور کہا۔ "خورشید، آج تو تم نے کمال کر دیا ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کو آفتاب موسیقی کا خطاب مل چکا ہے منٹو صاحب۔"

میں نے تو کچھ نہ کہا، لیکن میری بیوی نے پوچھا۔ "کب؟"

سردار زور اور سنگھ نے کہا۔ "اخبار کا وہ کٹنگ لانا۔"

خورشید اخبار کا کٹنگ لائی۔ کوئی خوشامدی قسم کا رپورٹر تھا جس نے چھ مہینے پہلے ایک پرائیویٹ محفل میں خورشید کا گانا سن کر اُسے آفتاب موسیقی کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ میں یہ کٹنگ پڑھ کر مسکرایا اور شرارتاً خورشید سے کہا۔ "آپ کا یہ خطاب غلط ہے!"

سردار زور اور سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔ "کیوں؟"

میں نے پھر شرارتاً کہا۔ "عورت کے لئے آفتاب نہیں —— آفتابہ ہونا چاہیئے۔ خورشید صاحبہ، آفتاب موسیقی نہیں۔ آفتابہ موسیقی ہیں۔"

میرا مذاق سب کے سر پہ سے گذر گیا۔ میں نے خدا کا شکر کیا، کیونکہ یہ مذاق کرنے کے بعد میں نے فوراً ہی سوچا تھا کہ اور کوئی نہیں تو سردار زور اور سنگھ ضرور اس کو سمجھ جائے گا، مگر وہ مسکرایا۔ "یہ اخبار والے ہمیشہ غلط زبان لکھتے

ہیں۔ آفتاب کی جگہ آفتابہ ہونا چاہیئے تھا۔ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔"

میں نے اور کچھ نہ کہا، اس لئے کہ مجھے احساس تھا کہ کہیں میرا مذاق فاش نہ ہو جائے۔

ساوک کچھ اور ہی خیالات میں غرق تھا۔ اس کو سردار زورا ور سنگھ کی دوستی کے واقعات یاد آرہے تھے۔ "مسٹر منٹو، ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ہمیشہ میرے ساتھ انتہائی خلوص برتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ہسپتال میں بیمار تھا۔ اس نے نرسوں سے بڑھ کر میری خدمت کی۔ میرے گھر بار کا خیال رکھا۔ خورشید اکیلی گھبرا جاتی، مگر اس نے ہر طرح اُس کی دلجوئی کی۔ میری بچی کو گھنٹوں کھلاتا رہا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بیٹھ کر کئی اخبار پڑھ کر سناتا رہا۔ میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔"

یہ سن کر سردار زورا ور سنگھ مسکرایا اور خورشید سے مخاطب ہوا۔ "خورشید آج تمہارا خاوند بہت سنٹی مینٹل ہو رہا ہے ۔۔۔ میں نے کیا کیا تھا جو یہ میری اتنی تعریف کر رہا ہے۔"

ساوک نے کہا۔ "بکواس نہ کرو ۔۔۔ تمہاری تعریف میں کر ہی نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری دوستی پر مجھے ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک تم ایک سے رہے ہو۔ میرے ساتھ تمہارے سلوک میں کبھی فرق نہیں آیا۔"

میں نے سردار زوراور سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ یہ تعریفی کلمات یوں سن رہا تھا۔ جیسے ریڈیو سے خبریں۔ جب ساوک بول چکا تو اُس نے مجھ سے پوچھا "تو خورشید کو پروگرام مل جائیں گے نا؟"

میں نے چونک کر جواب دیا۔ "جی؟ —— میں کوشش کروں گا۔"

سردار زوراور سنگھ نے ذرا حیرت سے کہا۔ "کوشش؟ —— یعنی ان کے لئے پروگرام حاصل کرنے کے لئے آپ کو کوشش کرنی پڑے گی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں —— کل صبح اِن کو اپنے ساتھ لے جایئے۔ میرا خیال ہے ان کا گانا سنتے ہی میوزک ڈائرکٹر اسی مہینے میں ان کو کم از کم دو پروگرام دے دے گا۔"

میں نے اُس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور کہا۔ "یقیناً!"

لیکن خورشید نے سردار زوراور سے کہا۔ "میں صبح نہیں جا سکتی۔ بے بی صبح کو میرے بغیر گھر میں نہیں رہ سکتی۔ دوپہر کو البتہ جا سکتی ہوں۔"

سردار زوراور سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو صاحب، واقعی بچی اس کو صبح بہت تنگ کرتی ہے میں کسی روز خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لے آؤں گا۔"

خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لانے کی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ میں نے دوسرے روز ہی ایک دم ارادہ کیا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا جاؤں گا، چنانچہ میں اُس سے اگلے دن استعفےٰ دے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ میری بیوی مجھ سے کچھ دن بعد

چلی آئی۔ ہم مسز خورشٹ کا پڑیا اور سردار زورا ور سنگھ کو بھول گئے۔

میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا۔ بیماری کے باعث اتفاق سے ایک روز میں وہاں نہ گیا۔ دوسرے روز وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے مجھے ایک کاغذ دیا کہ کل ایک صاحب آپ سے ملنے یہاں آئے تھے۔ وہ یہ دے گئے ہیں۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ سردار زورا ور سنگھ کا تھا۔ مختصر سی تحریر تھی، "میں اور میری بیوی آپ سے ملنے یہاں آئے، مگر آپ موجود نہیں تھے —— ہم تاج ہوٹل میں ٹھہرے ہیں —— اگر آپ تشریف لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی —— مسز منٹو کو ضرور ساتھ لائیے گا۔"

کمرے کا نمبر وغیرہ درج تھا۔ میں اور میری بیوی اسی شام ٹیکسی میں تاج ہوٹل گئے۔ کمرہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ سردار زورا ور سنگھ وہاں موجود تھا۔ ہم جب اندر کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے خشخشی بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میری بیوی اس کی بیوی دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، چنانچہ اس نے پوچھا۔ "سردار صاحب، آپ کی مسز کہاں ہیں؟"

سردار زورا ور سنگھ مسکرایا۔ "ابھی آتی ہیں —— باتھ روم میں ہیں۔"

اس نے یہ کہا اور دوسرے کمرے سے خورشٹ نمودار ہوئی۔ میری بیوی اٹھ کر اس سے گلے ملی اور سب سے پہلا سوال اس سے یہ کیا۔ "بچی کیسی ہے خورشید؟"

خورشٹ نے جواب دیا۔ "اچھی ہے۔"

پھر میری بیوی نے اس سے پوچھا۔ "ساوک کہاں ہیں؟"

خورشٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ اور میری بیوی پاس پاس بیٹھ گئیں تو میں نے سردار زورآور سنگھ سے پوچھا۔ "سردار صاحب، آپ اپنی بیوی کو تو باہر نکالئے۔"

سردار زورآور سنگھ مسکرایا۔ خورشٹ کی طرف دیکھ کر اُس نے کہا۔ "خورشید میری بیوی کو باہر نکالو۔"

خورشٹ میری بیوی سے مخاطب ہو کر مسکرائی۔ "میں نے سردار زورآور سنگھ سے شادی کر لی ہے۔ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں۔"

میری بیوی نے یہ سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اُٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چلئے سعادت صاحب"۔۔۔ اور ہم کمرے سے باہر نکلے۔ خدا معلوم سردار زورآور سنگھ اور خورشٹ نے ہماری اس بدتمیزی کے متعلق کیا کہا ہوگا۔

۲۸ر جولائی ۱۹۵۰ء

باسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا، لیکن ماں کے سامنے اُس کی کوئی پیش نہ چلی۔ اوّل اوّل تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی اُسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک ٹالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا۔ اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اُس کو ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ دراصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آگیا تھا۔ چنانچہ اس نے دل میں سوچا۔ "یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے ہونے دو شادی۔ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی ـــــ میں نبھا لوں گا۔"

اُس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ لڑکی والے اُس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا اُن کو زبان دے چکی تھی۔ جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ پکی کرنے کے لئے لڑکی والوں

کے ہاں گئی۔ انہوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا۔ سعیدہ کی ماں، میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ پکی نہیں کر رہی ہو۔ شادی ہو گی تو اسی مہینے کی بیس کو ہو گی۔ نہیں تو نہیں ہو گی۔ اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے۔ سمجھ لیا۔"

دھمکی نے کام کیا۔ لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی۔ سب تیاریاں مکمّل ہوئیں۔ بیس کو دلہن گھر میں تھی۔ باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبّت سے پیش آیا۔ اُس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اُس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔

نئی دلہنیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اُس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے۔ شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائیگی۔ مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لئے میکے بھیج دیا۔ واپس آئی تو اُس کا خوف آلود شرمیلاپن ایک حد تک دور ہو چکا تھا۔ باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا۔ سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا۔"سعیدہ تم ڈری ڈری کیوں رہتی ہو۔"

سعیدہ یہ سُن کر چونکی۔" نہیں تو ــــ نہیں تو"

باسط نے اُس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔" آخر بات کیا ہے ــــ خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے ــــ کس بات کا ڈر ہے تمہیں...... میری ماں اتنی اچھی ہے۔۔ وہ تم سے ساسوں کا سا سلوک نہیں کرتی۔ میں تم سے اتنی محبّت کرتا ہوں ــــ پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا۔" یہ کہہ کر اُس نے سعیدہ کا منہ چوما۔

سعیدہ خاموش رہی۔ اُس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں۔

باسط نے اُس کو اور پیار کیا اور کہا۔" تمہیں ہر وقت ہنستی رہنا چاہیئے ــــ لو اب ذرا ہنسو ــــ ہنسو میری جان۔"

سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی۔ باسط نے پیار سے اس کو تھپکی دی۔" شاباش! ــــ اسی طرح مسکراتا چہرہ ہونا چاہیئے ہر وقت!

باسط کی یہ محبّت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لئے اُس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اُس کا رشتہ ناکام ثابت نہ ہو۔ اُس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کر سکتی۔ اُس نے اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لئے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ سعیدہ سے اس کی نبھ جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لئے اُس نے بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبّت پیدا کر لی تھی

اُس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی تعریف کرتا تھا۔ جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے' اس بات سے مطمئن ہے کہ اُس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ کیا ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔

شادی کو ایک مہینہ ہو گیا۔ اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئی۔ باسط کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آلود شرمیلا پن دور ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ یہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی تھی۔ باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے۔ اس کے بارے میں اُس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کو ڈانٹ پلائیں۔ "بکواس نہ کرو۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔"

باسط نے سعیدہ ہی سے کہا۔ "میری جان، تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

سعیدہ چونک اُٹھی۔ "جی؟"

اُس کے چونکنے پر باسط نے یوں محسوس کیا جیسے اُس نے سعیدہ کی کسی دکھتی رگ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ لہجے میں اور زیادہ پیار بھر کے اُس نے کہا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ اب تم اور زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

سعیدہ نے تھوڑے توقف کے بعد جواب دیا۔ "بات تو کچھ بھی نہیں — میں ذرا بیمار ہوں۔"

"کیا بیماری ہے — تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا؟"

سعیدہ نے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔ "امّی جان علاج کرا رہی ہیں میرا۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

باسط نے سعیدہ سے اور زیادہ دلچسپی لینا شروع کی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ہر روز چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے قفل لگے ٹرنک سے دوا نکال کر کھانے والی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ زور سے چونکی۔ سفوف کی کھلی ہوئی پُڑیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ باسط نے اس سے پوچھا۔ "یہ دوا کھاتی ہو؟"

سعیدہ نے تھوک نگل کر جواب دیا۔ "جی ہاں —— امّی جان نے حکیم صاحب سے منگوائی تھی۔"

"کچھ افاقہ ہے اس سے؟"

"جی ہاں!"

"تو کھاؤ —— اگر آرام نہ آئے تو مجھ سے کہنا۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

سعیدہ نے پڑیا فرش پر سے اٹھائی اور سر ہلا کر کہا۔ "جی اچھا۔"

باسط چلا گیا، اُس نے سوچا۔ "اچھا ہے، کوئی علاج تو ہو رہا ہے۔ خدا کرے اچھی ہو جائے۔ میرا خیال ہے یہ ڈر ور کچھ نہیں۔ بیماری ہے —— دور ہو جائیگی انشاءاللہ!"

اس نے سعیدہ کی اس بیماری کا اپنی ماں سے پہلی بار ذکر کیا تو کہنے لگی۔

"بکواس ہے۔ خدا کے فضل وکرم سے اچھی بھلی ہے۔کیا بیماری ہے اُسے؟"

باسط نے کہا۔"مجھے کیا معلوم امی جان؟ —— یہ تو سعیدہ ہی بتا سکتی ہے آپ کو۔"

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔"میں پوچھوں گی اُس سے"——

جب سعیدہ سے دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا۔"کچھ نہیں خالہ جان، سر میں درد رہتا تھا۔ امی جان نے حکیم صاحب سے دوا منگا دی تھی۔ اصل میں باسط صاحب بڑے وہمی ہیں —— ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ تم ڈری ڈری سی دکھائی دیتی ہو۔ مجھے ڈر کس بات کا ہو گا بھلا۔"

باسط کی ماں نے کہا۔"بکواس کرتا ہے۔ تم اس کی فضول باتوں کا خیال نہ کیا کرو۔"

چند روز کے بعد باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ بہت ہی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے۔ اس کا اضطراب اس کے رُوئیں روئیں سے ظاہر ہوتا تھا۔ شام کے قریب اُس نے باسط سے کہا۔"امّی جان سے ملنے کو جی چاہتا ہے —— مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔"

باسط نے جواب دیا۔"نہیں سعیدہ۔ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

سعیدہ نے اصرار کیا۔"آپ مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

باسط نے انکار کر دیا۔"وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ۔"

باسط کی ماں آگئی۔ باسط نے اس سے کہا۔ "امّی جان، دیکھئے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں کہتی ہے مجھے امّی جان کے پاس لے چلو۔"

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "کل چلی جانا سعیدہ۔"

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا۔ خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملی۔ باسط نے سوچا اوپر کوٹھے پر ہو گی۔ اُوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی۔ "سعیدہ!"

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا۔ "سعیدہ!"

اندر سے بڑی نحیف آواز آئی۔ "جی!"

باسط نے پوچھا۔ "کیا کر رہی ہو؟"

اور زیادہ نحیف آواز آئی۔ "نہا رہی ہوں۔"

باسط نیچے آگیا۔ سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں نکلا۔ موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آرہا تھا۔ جس میں سعیدہ نہا رہی تھی۔ باسط کے ذہن میں تلے اُوپر کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے۔ پھر یہ گردان شروع ہو گئی۔ "دوا ـــــ خون ـــــ خون ـــــ دوا ـــــ ڈر ـــــ دوا ـــــ خون ـــــ ڈر!"

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ پکی

نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ ــــ سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا ــــ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا۔ دوا کھانا۔ اور خاص طور پر آج بہت ہی زیادہ وحشت زدہ رہنا۔

باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی۔ جب وہ دلہن بن کر اُس کے پاس آئی تھی۔ اُس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے۔ چنانچہ آج وہ چیز ہو گئی۔ باسط نے سوچا۔ "کیا میں اُوپر جاؤں۔ جا کر سعیدہ کو دیکھوں ــــ اپنی ماں سے بات کروں۔"

ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی۔ ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہو گی۔ اُس کے جسم پر، اُس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیتا ہو گا اور کیا بیت رہا ہو گا۔ کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی۔ کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے۔ جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اُس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا۔ اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا۔ "بے چاری، معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے۔ ہوش میں بھی اُس پر جانے کیا گزر رہی ہو گی ــــ کیا وہ نیچے آ سکے گی؟"

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی۔ اُس کا رنگ

بے حد زرد تھا، اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ باسط نے اس کو دیکھا تو اُس پر بہت ترس آیا۔ اندر سے برقع اٹھایا اور اُس سے کہا۔ "چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

سعیدہ نے بہت ہمّت سے کام لیا۔ باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی۔ باسط نے ٹانگہ لیا۔ اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا۔ ماں نے اُس سے پوچھا۔ "سعیدہ کہاں ہے؟"

باسط نے جواب دیا۔ "ضد کرتی تھی۔ میں اُسے چھوڑ آیا ہوں۔"

باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا۔ "بکواس کرتے ہو۔ ضد کرنے دی ہوتی۔ تم ابھی طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو گے کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔"

باسط نے کہا۔ "نہیں امّی جان۔ سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔"

اُس کی ماں مسکرائی۔ "میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم اسے ضرور پسند کرو گے۔" پھر تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی۔ "اور ہاں باسط یہ اُوپر غسل خانے میں خون کیسا تھا۔"

باسط ٹھٹکا سا گیا۔ "وہ —— کچھ نہیں امّی جان۔ میری نکسیر پھوٹی تھی۔"

ماں نے بڑے غصّے کے ساتھ کہا۔ "کم بخت گرم چیزیں نہ کھایا کرو ——

جب دیکھو جیبیں مونگ پھلی سے بھری ہیں۔"

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا۔ پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا۔ اُس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اُس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہیگا۔ وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی۔ باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیئے کی سزا مل چکی تھی۔ مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے۔ اب اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا۔" وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اُس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی۔ باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا۔ سب کمرے دیکھے۔ ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ۔ اُس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سا نامکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا۔ اُس نے پہلے اُس بچے کو اٹھایا۔ کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا۔ پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اُس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔

سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ اسی طرح زرد تھی۔

تھی۔ پہلے سے زیادہ نڈھال۔ باسط کو بہت ترس آیا۔ اُس سے کہا۔ "سعیدہ جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ رونا بند کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ۔"

اندر جانے کے بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی۔ جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ باسط خاموش رہا۔ سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے ۔۔۔ باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔ "زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ ۔۔ جو خدا کو منظور تھا ہو گیا۔"

دوسرے روز اُس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفنا دیا۔

۲۹۔ جولائی ۱۹۵۰ء

شارَدا

نذیر بلیک مارکٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگرٹ والے کی دکان سے اس کو اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اُس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پگ اُس میں بیٹھ کر پیئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا، "موسم

دیکھ کتنا اچھا ہے۔" پھر وہ اُسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چخ چخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے وہ بیس پچیس گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا۔ "کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو۔ کبھی نظر ہی نہیں آتے۔"

اُس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "حضور، میں تو یہیں ہوتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے؟"

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا۔ "میں اب جو تشریف لے آیا ہوں۔"

"تو چلئے میرے ساتھ۔"

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ "چلو۔"

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔

"باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔"

یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلّال ہے۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"کریم ۔۔۔ آپ بھول گئے تھے!"

نذیر کو یاد آگیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اُس کے لئے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایماندار دلّال تھا۔ اُس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ کریم سے اس نے معذرت چاہی۔ "یار میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔"

"جی ہاں۔"

"تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا تا کا ہوا کرتا تھا؟"

کریم نے بیڑی سلگائی اور ذرا فخر سے کہا۔ "وہ میں نے چھوڑ دیا۔ آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔"

نذیر نے اس کو داد دی۔ "یہ بہت اچھا کیا ہے تم نے؟"

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا۔ "دس چھوکریاں ہیں ۔۔۔ ایک بالکل نئی ہے۔"

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ "تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔"

کریم کو بُرا لگا۔ "قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سؤر کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو۔" پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔ "آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پسنجر آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔"

نذیر نے پوچھا۔ "کنواری تھی؟"

"جی ہاں ـــــ دو سو روپئے لئے تھے اُس پیسنجر سے؟"

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا۔ "لو، یہیں بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔"

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بُری لگی۔ "قسم قرآن کی، سؤر ہو جو آپ سے بھاؤ کرے آپ تشریف لے چلئے۔ آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہوگا۔ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔"

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن پیئے مسرور تھا۔ "چلو یار آج تمام عیاشیاں۔ بس ایک بوتل کا اور بندوبست ہوجانا چاہیئے۔"

کریم نے پوچھا۔ "آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟"

"پینتیس روپے میں۔"

"کون سا برانڈ ہے؟"

"جونی واکر!"

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔"

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیئے۔

"ٹیکی اور پوچھ پوچھ ـــــ یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا۔ تم جانتے ہو، میں ایسے معاملوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔"

کریم مسکرایا۔ "اور آپ کو یاد ہوگا۔ میں ڈیڑھ پگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔"

نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پگ لیا کرتا تھا۔
یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا۔ "لیکن آج دو رہیں۔"

"جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔"

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر "میرینا ہوٹل" لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا۔ مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سود خوار پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا، یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا۔ "تشریف رکھیے، لیکن میں یہ عرض کر دوں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا۔"

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا۔ "دس روپے زیادہ ہیں یار؟"

کریم نے کہا۔ "بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔"

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو ـــــ کرایہ پیشگی دے دوں؟"

"جی نہیں ـــــ آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔

کریم نے اس سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔"

لڑکی نظریں نیچی کئے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا۔ "اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب ـــــ میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔"

نذیر آرام کرسی پر سے اُٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا۔ "آپ کا نام۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے جناب؟"

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "شکنتلا"

اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی۔ جس پہ راجہ دشینت عاشق ہوا تھا۔ "میرا نام دشینت ہے۔"

نذیر مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ اتنے میں کریم آ گیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔ "مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔"

نذیر بہت خوش ہوا۔ "تم کمال کرتے ہو۔" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟"

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا۔ "نذیر صاحب۔ یہ نہیں پیتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔"

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے۔"

کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لئے ایک بڑا پگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا۔ "آپ راضی کر لیجئے اسے۔"

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پگ پیا۔ فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہو گئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا۔ "چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟"

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اُسے پسند ہے کہ نہیں لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اُسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دشینیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بُری نہیں تھیں۔ آہو چشم تو نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اُس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا۔ "ٹھیک ہے یار —— بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟"

کریم نے آدھا پگ اپنے لئے اور انڈیلا اور کہا۔ "سو روپئے!"

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے!"

کریم اپنا دوسرا آدھا پگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اُس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے اس لئے کہ شکنتلا بالکل الھڑ تھی۔ اُس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر اک اناڑی تیراک

کے ساتھ اِدھر اُدھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اُکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا۔ "کیا بات ہے نذیر صاحب؟"

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا۔ "کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟"

"کیوں؟"

"کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

کریم نے شکنتلا کو الگ لیجا کر بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا۔ "میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

نذیر نے اس کو روکا۔ "جانے دو ــــ کوئی اور لے آؤ۔" لیکن اُس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا۔ "وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے، اُس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں اُنہیں یہاں بھیج دو ــــ میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!"

کریم، نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے اِن سب کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا۔ چنانچہ اُس نے ان لڑکیوں کے لئے گلاس منگوائے

اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک اُن لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی۔ دور ہو گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اُس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگرٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اُس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں لے دیگا۔ چنانچہ وہ اُس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اُس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا۔ "نذیر صاحب، شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے —— بہت ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لیں گے۔"

نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اُس نے اپنے دل میں اتنا کہا۔ "چلو دیکھ لیتے ہیں —" لیکن اُس نے کریم سے کہا۔ "تم پہلے یار وسکی لے آؤ۔" یہ کہہ کر اُس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لیکر نذیر سے کہا۔ "میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھیے۔"

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے۔ لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر

اس نے سگرٹ سلگایا اور اپنی ٹانگیں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اُس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا۔ "نذیر صاحب آرہی ہے لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اُسے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل صورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی۔ تیوڑی چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پروائی سے اُس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر "آداب" کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اُس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ شکنتلا کی بہن ہیں۔"

اُس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "جی ہاں۔"

نذیر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی۔ بڑے غور سے دیکھا۔ نذیر کی یہ حرکت اُس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اُس سے مخاطب ہوئی۔ "آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟"

وہ برس پڑی۔ "میں ناراض کیوں نہ ہوں —— یہ آپ کا کریم میری بہن کو

جے پور سے اڑا لایا ہے۔ بتائیے آپ میرا خون نہیں کھولے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟"

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اُس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ "شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت الھڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید بُرا مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔"

اُس نے کچھ نہ کہا۔ نذیر نے اُس سے دریافت کیا۔ "آپ کا نام؟"

شکنتلا کی بہن نے مختصراً کہا۔ "شاردا"

نذیر نے پھر اُس سے پوچھا۔ "آپ کا وطن؟"

"جے پور۔" اُس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "دیکھئے، آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا "یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔"

لڑکی کے ماتھے پر بیشمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اُس نے تین چار مرتبہ زمین پر

تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔ "بتایئے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں"

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی نذیر نے اُسے روکا۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟

وہ ایک دم ماں بن گئی "منی رو رہی ہے، دودھ کے لئے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی

نذیر نے اُس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔ اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لیکر آ گیا۔ اُس نے نذیر کے لئے چھوٹا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے —— میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہوگا؟"

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بڑی غصیلی عورت ہے!"

"جی ہاں —— صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے۔ آپ ذرا اس کو رام کریں —— شکنتلا خود یہاں آئی تھی۔ اس لئے کہ اُس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا —— اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے —— آپ منا لیجئے نا اس کو؟"

نذیر نے اس سے کہا۔ "منانے کی کیا بات ہے؟"

کریم نے اس کو آنکھ ماری "سالی مجھ سے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے

ڈانٹ رہی ہے۔"

اتنے میں نثار دا اپنی ایک سال کی بچّی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو اس نے غصّے سے دیکھا۔ اُس نے آدھا پگ پیا اور باہر چلا گیا۔

مُنّی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اُس کو پانچ کا نوٹ دے کر کہا۔ "جاؤ، ایک وکس کی بوتل لے آؤ۔"

کریم نے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتی ہے؟"

نذیر نے اس سے کہا۔ "زکام کی دوا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک پُرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا۔ "کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر مُنّی کی طرف متوجہ ہُوا۔ اُس کو بچّے بہت اچھے لگتے تھے۔ مُنّی خوش شکل نہیں تھی۔ لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لئے دلکش تھی۔ اُس نے اُس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور نثار دا سے کہا۔ "اس کی ماں تو میں ہوں۔"

نثار دا مسکرائی۔ "لائیے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔"

نثار دا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آگئی۔ اب اس کے چہرے پہ غصّے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے نثار دا سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں۔" اور اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ

لگا لیا۔ شاردا نے غصے کا اظہار نہ کیا۔ "جواب دیجئے جناب ؟"

شاردا خاموش رہی۔ نذیر نے اٹھ کر ایک پگ پیا، تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اُس سے کہا۔ "مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔"

نذیر نے ایک پگ گلاس میں ڈالا۔ اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا۔ "آپ کو اس سے نفرت ہے۔ کیوں ؟"

شاردا نے مختصر سا جواب دیا۔ "بس ہے۔"

"تو آج سے نہیں رہے گی ـــــ یہ لیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

"میں ہرگز نہیں پیوں گی۔"

"میں کہتا ہوں، تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔"

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹا غٹ پی گئی۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ کر اُس نے نذیر سے کہا، "یہ پہلی اور آخری بار ہے۔ لیکن میں نے کیوں پی ؟"

نذیر نے اُس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا۔ "یہ مت پوچھو۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اُس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اُس نے نذیر سے کہا۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجئے۔"

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گذشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ وہ اُس کے جنسی سوالات کا سو فی صدی صحیح جواب تھی۔ اُس نے کریم سے کہا۔ "میں کل ادا کر دوں گا —— ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔ آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپئے باقی تھے۔"

کریم نے کہا۔ "کوئی واندہ نہیں ہے —— میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا —— حضور، میری جان کھا گئی تھی۔ اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی!"

کریم چلا گیا۔ شاردا آئی —— اُس کی گود میں مُنی تھی۔ نذیر نے اُس کو پانچ روپئے دئے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اُس سے مسکرا کر کہا۔ "میں اس کا باپ ہوں۔ تم یہ کیا کر رہی ہو۔"

شاردا نے روپئے لے لئے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لیکر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا۔ "لو بھئی شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤنگا۔"

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اُس نے کریم کو پچھلے روپئے ادا کئے۔ ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کو پینے کے لئے کہا تو وہ بولی "میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔"

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا — جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن شاردا اپنی واجبی شکل وصورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نذیر بار بار سوچتا تھا "یہ کیسی عورت ہے — میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پُرگو عورت نہیں دیکھی۔"

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اُس کو روپئے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ساٹھ روپئے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپئے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپئے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا۔ مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گذر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اُس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردا اُس کی ازدواجی زندگی میں بہت بُری طرح خائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس

ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بری بات تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لئے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا۔ "شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رُخ نہ کروں۔"

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ "جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔"

نذیر نے اُس کا پیار لیا اور کہا۔ "بکواس نہ کرو ــــ تم میرا مطلب نہیں سمجھیں بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔"

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اُس کو بلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا ــــ "آپ یہ روپے لے لیجئے ــــ اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے۔"

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپئے واپس کر دئے شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اُس نے آداب عرض کیا، اور کہا۔ "میں آج شام کو جے پور

جا رہی ہوں۔"

نذیر نے پوچھا۔ "کیوں؟"

شاردا نے یہ مختصر جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔" اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اُسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اُس کو یوں محسوس ہوُا کہ اُس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا۔ "نذیر صاحب آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟"

نذیر نے اس سے کہا۔ "بھائی، میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں ــــ ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل کے، اور اُوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے ــــ خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔"

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا۔ "بھئی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔"

کریم نے کہا۔ "نذیر صاحب اُس کو آپ سے محبت تھی۔"

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا ایک جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اُس نے مختصر الفاظ میں

جس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اُس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لئے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اُس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اُس سے علیحدہ ہُوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا تھا۔ کہ وہ اُس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پسینجر آتے تھے۔ ایک رات کے دو دو سو روپئے دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا۔ "تم کیا کر رہی ہو" وہ جواب دیتی۔ "اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔"

شاردا نے نذیر سے ایک بار اُس کا فوٹو مانگا تھا۔ جو اُس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔ یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی۔ اُس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا— جب دونو بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا۔ وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی، نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ

نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گذرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اُس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لاکر اُسے دی۔ سارے خط وہی کھولا کرتی تھی۔ ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا "معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی۔" نذیر نے خط لیکر دیکھا۔ اُس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اُسے دیا۔ "ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔"

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا "ہندی ہے" اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔ "جے پور — پریتے نذیر صاحب۔" اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی۔ "آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔" نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اُس نے کاغذ کا دوسرا رُخ دیکھا۔ "کوئی شاردا ہے۔"

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ "خدا معلوم کون ہے — میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا۔" اُس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے

پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبے سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اُس کو اتنے بڑے مصوّر سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ

شام کو گھر آیا تو اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنا دی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ "عرصہ ہوا ہے میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔ مصوّری کا اُسے بھی شوق تھا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اُس کو بھی نذیر نے اُسی طریقے سے گول کیا۔ اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے، صبح آ کر وہ اُس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کیے۔ اس کے بعد شاردا اُس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن خط اس اظہار سے پُر ہوتے تھے۔ گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے اس لئے

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لئے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا، اور نذیر کہہ دیتا تھا۔ "ٹھیک ہے!"

شاردا بمبئی آنے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھیرنا چاہتی تھی۔ نذیر اُس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے، چنانچہ اُس نے شاردا کو لکھوایا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔ "میں کچھ دیر وہاں ہونگی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آجاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔"

نذیر نے کچھ دیر اُسے روکا۔ مگر جب اُس کا بھائی لاہور جانے کے لئے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اُس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آرہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لیکر شام کے سات بجے تک اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی

نہیں تھا۔ اُس نے سوچا "میں اپنے نوکر کو رازدار بنالوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائیگا دس پندرہ روپئے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اُس سے کچھ نہیں کہے گا۔"

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیر میل آئی مگر شاردا تلاش کے باوجود اُسے نہ ملی۔ اُس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رُک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔

اس سے اگلے روز وہ حسبِ معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہالکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا۔ "شاردا!"

شاردا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ "نذیر صاحب!"

"تم یہاں کہاں؟"

شاردا نے شکایتاً کہا۔ "آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا۔ "تم یہاں ٹھیرو۔ میں دفتر سے چھٹی لیکر ابھی آتا ہوں۔"

شاردا کو بنچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھکر وہاں چپڑاسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات

نہ کی، لیکن اُن کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا۔ "تم نہالو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں۔"

شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا۔ "کہ اُس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے اُس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔ وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی بیشمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی۔ اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا۔ "یہ محبت کیا ہے — اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اُس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں، مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔"

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر ناک بند کر کے وہ پگ پی لیا۔ بُرا سا منہ بنایا۔ پانی لے کر کلی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا

نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ "تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو آ گئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کچیلے دن۔ یہاں ہر چیز اُجلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں۔ کریم بھی نہیں۔ یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔"

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اُس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں۔ راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پگ پیا اور سوچا "کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو ——— بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔"

•

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ بستر صاف تھا۔ شاردا صاف تھی۔ وہ خود صاف تھا۔ کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی، نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا۔ شاید اس نے کم پی ہے۔ اُٹھ کر اس نے ایک پگ بنایا اور ایک ہی جُرعے میں ختم کر کے شاردا

کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی ہجر و فراق کی باتیں۔ وہی گلے شکوے۔ نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اُس کے جسم کو کند کر دیا۔ اُس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے اُس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ پھر بھی اُس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہؤا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس، مگر جب اُس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے، اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ اُس کا گھر ہوٹل بن جائے وہ دس روپئے کرائے کے دے۔ کریم کو پچاس روپئے ادا کرے اور چلا جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی ـــــ ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں۔ وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اُس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اُس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اُس کے تحت الشعور میں تھا، اسی لئے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ کہ معاملہ کیا ہے کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے، کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا، اتنی دیر کے بعد ملی ہے۔ دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی وہی پرانی

شاردا بن جائے گی۔"

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا، وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اُس کی بچی جے پور میں تھی ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لئے، اُس کی پھنسیوں کے لئے، اُس کے گلے کے لئے دوائیں منگوایا کرتا تھا اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اُسکی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے۔ اور اُس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اُس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔۔ اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں ــــ کسی کو پالنا۔ اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے"

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اُس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اُس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جُدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر

بھی نذیر کو چاہتی تھی لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو بھی کچھ تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اُس کے ساتھ گذارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اُس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اُٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ بازار سے اُون خرید کر اس کے لئے ایک سویٹر بن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اُس کے لئے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کرا کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے، اس لئے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لئے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا۔ اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟ —— کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گذارے تھے، مگر یہ اُس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا —— محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس جے پور جانا چاہیئے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بیشمار کئے تھے مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔ اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی۔ وہ اس سے رُوکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی۔ "یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے ——— میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں، ——— اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خط لکھتا ہوں، جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں ——— جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اُس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ اُدھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا، یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟"

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اُسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری

کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اُس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گذرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی۔ "میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی۔ جب اس نے تار بھیجا تھا۔ لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا"

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اُس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا۔ اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اُس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس رویّے سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لئے کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا "بکواس نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگرٹ میرے سارے ختم ہیں۔"

دفتر کے پاس کی دکان سے اُس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگرٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے۔ اس لئے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگرٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا۔ "یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟"

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اندر الماری میں پڑا تھا۔"

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا، شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔ اندر الماری میں پڑا تھا۔"

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔ "شاردا، تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لئے ہر روز سگرٹ خریدا کرو۔"

شاردا نے بڑے پیار سے کہا۔ "آپ بھول جاتے ہیں، اسی لئے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔"

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہے ——— لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔"

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا۔ "میں آپ سے معافی مانگتی ہوں"۔
نذیر نے ایک لمحے کے لئے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اُسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیئے اس لئے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپئے درکار ہوں گے دے دوں گا"۔
لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور رذیل ہے۔
شاردا نے کچھ نہ کہا۔ رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اُس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اُٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھیں۔ پھر بھی اُس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا۔ "میں بنک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں"۔
بنک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھا۔ وہ دو سو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اُس کا ارادہ تھا۔ کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر وہ جب گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اُس نے پوچھا

"کہاں؟"

نوکر نے بتایا۔ "جی مجھ سے انہوں نے کچھ نہیں کہا — اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں!"

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا!

۳۱ر جولائی ۱۹۵۰ء

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جاسکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھُوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پرُواہ نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نہ ... ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے ——— وہ وجودِ خاکی جر ... بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کے باوجود۔ خدا نے ... فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجا...

ممتاز شیریں